میر تقی میر

نثار احمد فاروقی

قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل (حکومت ہند)
ویسٹ بلاک۔۱، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی

نثار احمد فاروقی

قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل (حکومتِ ہند)
ویسٹ بلاک۔ ۱، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی

پیش لفظ

پیارے بچو! علم حاصل کرنا وہ عمل ہے جس سے اچھے بُرے کی تمیز آجاتی ہے۔ اس سے کردار بنتا ہے، شعور بیدار ہوتا ہے، ذہن کو وسعت ملتی ہے اور سوچ میں نکھار آجاتا ہے۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو زندگی میں کامیابیوں اور کامرانیوں کی ضامن ہیں۔

ادب کسی بھی زبان کا ہو، اس کا مطالعہ زندگی کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ بچو! ہماری کتابوں کا مقصد تمھارے دل و دماغ کو روشن کرنا ہے اور ان چھوٹی چھوٹی کتابوں سے تم تک نئے علوم کی روشنی پہنچانا ہے، نئی نئی سائنسی ایجادات، دنیا کی بزرگ شخصیات کا تعارف کرانا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اچھی اچھی کہانیاں تم تک پہنچانا ہے جو دلچسپ بھی ہوں اور جن سے تم زندگی کی بصیرت بھی حاصل کر سکو۔

علم کی یہ روشنی تمھارے دلوں تک صرف تمھاری اپنی زبان میں یعنی تمھاری مادری زبان میں سب سے مؤثر ڈھنگ سے پہنچ سکتی ہے۔ اس لیے یاد رکھو کہ اگر اپنی مادری زبان اردو کو زندہ رکھنا ہے تو زیادہ سے زیادہ اردو کتابیں خود بھی پڑھو اور اپنے دوستوں کو بھی پڑھواؤ۔ اس طرح اردو زبان کو سنوارنے اور نکھارنے میں تم ہمارا ہاتھ بٹا سکو گے۔

قومی اردو کونسل نے یہ بیڑا اٹھایا ہے کہ اپنے پیارے بچوں کے علم میں اضافہ کرنے کے لیے نئی نئی اور دیدہ زیب کتابیں شائع کرتی رہے جن کو پڑھ کر ہمارے پیارے بچوں کا مستقبل تابناک بنے اور وہ اپنے بزرگوں کی ذہنی کاوشوں سے بھرپور استفادہ کر سکیں۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

ڈائرکٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

فہرست

پہلا باب — سوانح حیات — ۱۱

مری خلق محوِ کلام سب، مجھے چھوڑتے ہیں خموش کب
مرا حرف رشکِ کتاب ہے، مری بات لکھنے کا باب ہے

(میرؔ)

دیباچہ

ترقی اردو بیورو نے اردو نظم و نثر کے بڑے فن کاروں پر عام معلومات کی تعارفی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے زیرِ نظر کتاب بھی اُسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اِسے لکھتے ہوتے چند باتوں کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے۔ پہلی بات یہ کہ میرؔ کے مستند حالاتِ زندگی اختصار اور زمانی تسلسل کے ساتھ بیان ہو جائیں۔ غیر ضروری باتوں کو چھوڑ دیا جاتے اور کتاب کو طلبہ کے لیے مفید اور معاون بنایا جائے۔

یہ بھی کوشش رہی ہے کہ شاعر کی زندگی اور تصانیف کا کوئی اہم پہلو چھوٹنے نہ پائے۔ تنقیدی حصّہ اِس میں جان بوجھ کر ہلکا رکھا گیا ہے کیونکہ اِس کتاب کا مقصد تنقید نہیں تعارف ہے۔

میرؔ کی کلّیات بہت ضخیم ہے۔ چھ دیوانوں سے کتنا بھی مختصر انتخاب کیا جائے وہ ڈیڑھ دو سو صفحات سے کم میں نہیں سما سکتا اس لیے ہم نے صرف دیوانِ اوّل کی غزلیات کا ایک نمایندہ انتخاب پیش کر دیا ہے۔

جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے اور جو ایک طالبِ علم کے لیے مزید تفصیلی مطالعہ میں

بہت مفید ہو سکتی ہیں ان کی مختصر فہرست آخر میں شامل کر دی گئی ہے۔

میں ترقی اردو بیورو کا تہ دل سے ممنون ہوں جس کی دلچسپی اور توجہ کی بدولت یہ مختصر کتاب وجود میں آ رہی ہے۔

پہلا باب

سوانح حیات

میر محمد تقی میرؔ کو "خدائے سخن" کہا گیا ہے۔ اردو کے عظیم اور لازوال شاعروں کی کتنی ہی مختصر فہرست بنائی جائے وہ میرؔ کے نام سے خالی نہیں ہوسکتی۔ ہاں اگر سوال یہ ہو کہ اردو کا سب سے بڑا شاعر کون ہے تو ممکن ہے بعض لوگ مرزا غالب کو پہلا نمبر دیں۔ مگر خود مرزا غالب نے بھی میرؔ کی استادانہ عظمت اور فن کارانہ صلاحیّت کا اعتراف کیا ہے۔

ریختے کے تمھیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

دوسری جگہ میر کی شاعری کے رنگا رنگ اسالیب کو یوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

میرؔ کے شعر کی کیا بات کہوں اے غالب
جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

غالب کے معاصر اور آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے استاد خاقانی ہند ملک الشعراء محمد ابراہیم ذوقؔ دہلوی نے بھی میر کے کمال فن کو اس طرح سراہا ہے۔

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

اور آخری بات تو خود غالب نے کہدی ہے۔ وہ ناسخ کے "قول" کو اپنا "عقیدہ" بنا کر پیش کر رہے ہیں۔

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

میرؔ بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہے اس نے چھ دواوین پر مشتمل ایک ضخیم کلیات اپنی یادگار چھوڑی ہے۔ فارسی زبان میں شعرائے اردو کا ایک تذکرہ نکات الشعراء اور خود نوشت سوانح عمری ذکر میر اور رسالہ فیض میر فارسی نثر پر ان کی قدرت کے گواہ ہیں اور فارسی غزلیات کا ایک مکمّل دیوان بھی موجود ہے۔ شاعری کی تقریباً تمام اصناف میں اُنھوں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی، وغیرہ۔ لیکن ان کی شہرت کا ایوانِ بلند غزل کے ان وجد آفریں، شور انگیز اور کیف آور اشعار پر قائم ہے جنھیں تیر و نشتر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ روایتی طور پر میرؔ کے بہتّر (۷۲) نشتر مشہور ہو گئے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے صرف (۷۲) اشعار ہی اچھے کہے ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ بقول نواب محمّد مصطفیٰ خاں شیفتہ، اگرچہ بعض پست اور ڈھیلے مضامین بھی اُن کی شاعری میں بندھے ہیں، مگر جو کچھ اُنھوں نے اپنے فن کا رانہ مقام سے کہا ہے وہ لفظ و معنیٰ دونوں کے اعتبار سے بہت بلند ہے۔ میرؔ جیسے عظیم فن کار روز روز پیدا نہیں ہوتے:

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

خاندان

میرؔ نے اپنے حالات خود ہی فارسی زبان میں " ذکرِ میر" کے نام سے قلمبند کیے ہیں لیکن ان میں کہیں تفصیل نہیں ہے۔ اور جو تفصیل ہے وہ غیر ضروری ہے۔ اُن کے زمانے میں ایرانی شاعروں کی نئی کھیپ ایران سے ہجرت کر کے ہندستان خصوصاً دلّی کی طرف آرہی تھی اور انھوں نے ایسا ماحول پیدا کردیا تھا کہ ہندستان کے فارسی داں احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گئے تھے۔ فارسی جدید کے محاوروں کو سمجھنے اور برتنے کا ایک نیا ولولہ پیدا ہوا تھا اسی لیے اس زمانے میں فارسی لغت کی کئی کتابیں تالیف کی گئیں جن میں بعض غریب الفاظ اور محاوروں کی سند خود ایرانیوں سے دریافت کر کے لکھی گئی تھی سراج الدّین علی خاں آرزو کی فارسی لغت "چراغِ ہدایت" ایک ایسی ہی کتاب ہے جس میں فارسی جدید کے محاوروں کو درج کیا گیا ہے اور ان کی سند میں یہ لکھا ہے کہ " اہلِ زبان سے اس کی تحقیق کی گئی"۔ فارسی کو نئے سرے سے قابو میں لانے کی ایک اور قابلِ تعریف کوشش لالہ ٹیک چند بہار کی تالیف " بہارِ عجم " بھی ہے۔ کہتے ہیں کہ جب نادر شاہ نے دلّی پر چڑھائی کی اور لال قلعہ میں مقیم رہا تو اس کے سپاہی دلّی کے بازاروں اور کوچوں میں گشت لگاتے پھرتے تھے۔ اس پُر آشوب زمانے میں لالہ ٹیک چند اپنی لغت بہارِ عجم کا بستہ بغل میں دبائے ان ایرانی سپاہیوں کے پیچھے پیچھے پھرتے تھے اور ان سے فارسی جدید کے الفاظ و محاورات کے معانی دریافت کرتے تھے۔ اسی رجحان کا مظاہرہ ذکرِ میر میں بھی ہوا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرؔ کے سامنے یہ مقصد کم رہا ہے کہ وہ اپنے اور اپنے خاندان کے حالات لکھیں، فارسی جدید کے محاورات باندھنے پر انھوں نے اپنی توجہ زیادہ مرکوز رکھی ہے۔

اپنے نسب کے سلسلے میں وہ فاطمی سیادت کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ان کے بعض معاصرین کے ہجویہ اشعار سے ظاہر ہے کہ لوگ ان کی سیادت میں شک کرتے تھے، بعض نے اس طرح کے اشارے بھی کیے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ خاندان میر کو حسب (پیشے) کے اعتبار سے نانبائی سمجھا جاتا تھا۔

بیٹھے دکان طبع کو جب گرم کرکے میر
کچھ شیرمال سامنے کچھ نان کچھ پنیر
میری کے اب تو سارے مسالے ہیں مجتمع
بیٹا تو گندنا بنے اور آپ کو تھمیر

دوسری ہجویہ رباعی میں بھی ایسا ہی اشارہ ملتا ہے۔

روٹی کے لیے کہاتے تم بھرجی میر
کہیے تو بجا ہے آپ کو خبزِ خمیر
پر میر ہوتے یہ اس طرح کے جیسے
ساگوں میں ہے کوتھمیر راگوں میں ہمیر

میر کے دادا

بہرحال اپنے خاندان کے بارے میں میر کا بیان ہے کہ میرے بزرگ حجاز (عرب) سے ہندستان آئے۔ پہلے یہ قافلہ دکن کے ساحل پر اُترا وہاں سے کچھ لوگ ہجرت کرکے گوالیار آگئے اسی خاندان کی ایک شاخ آگرہ کو منتقل ہوگئی میر کے بیان کے مطابق اُن کے دادا (جن کا نام نہیں بتاتے)

نواحِ آگرہ کے فوجدار تھے۔ یہ خاصا بڑا عہدہ تھا اور آج کل کے ڈپٹی کلکٹر کی برابر تھا لیکن اس عہد کی تاریخوں میں کہیں اُن کے خاندان کے کسی فرد کا ذکر نہیں ملتا۔

میرؔ کے والد

میرؔ کے دادا کے دو بیٹے ہوئے۔ بڑے خلل دماغ سے خالی نہ تھے اور جوان فوت ہوتے اُنھوں نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ دوسرے اور چھوٹے بیٹے محمّد علی میرؔ کے والد تھے۔ یہ ۱۰۸۲ھ (۱۶۷۱ء) کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے آگرہ کے ایک بزرگ شاہ کلیم اللہ اکبرآبادی (متوفی ۱۱۰۹ھ – ۱۶۹۷ء) سے تعلیم حاصل کی اور اُنھیں کے مرید بھی ہوئے۔ میرؔ کا بیان ہے کہ اِنھیں لوگ "علی متقی" کہہ کر پکارتے تھے۔

میر محمّد علی کی پہلی شادی سراج الدین علی خاں آرزو (متوفی ۱۱۶۹ھ / ۱۷۵۵ء) کی بہن سے ہوئی تھی۔ اُن کے بطن سے میرؔ کے سوتیلے بڑے بھائی حافظ محمّد حسن پیدا ہوئے غالبًا پہلی بی بی کے انتقال کے بعد محمّد علی نے دوسری شادی کی تھی۔ وہ کس خاندان میں ہوئی اس کا علم نہیں۔ اِن دوسری بیوی کے بطن سے میر محمّد تقی ۱۱۳۵ھ / ۱۷۲۳ء کے آخر میں پیدا ہوتے ان کے دوسرے چھوٹے بھائی محمّد رضی تھے اور غالبًا ایک بہن بھی تھیں۔

میرؔ نے اپنے والد کے حالات تو کچھ نہیں لکھے اُن کی درویشی اور ولایت پر زیادہ زور دیا ہے کچھ ان کی کرامات بیان کی ہیں اور بعض ملفوظات نقل کیے ہیں۔ محمّد علی خود ایک عبادت گذار درویش تھے اور اُن کے کچھ مرید بھی تھے۔ ان کا تکیہ یا خانقاہ آگرہ میں شہر پناہ کے باہر عیدگاہ کے پاس تھا۔

محمد علی کو درویشوں سے ملنے کا ذوق تھا اور وہ شہر کے تکیوں میں فقیروں سے ملاقات کرنے بھی جاتے تھے۔ یہ فقرا بھی اُن کا احترام اور رعایت کرتے تھے ایسی کچھ ملاقاتوں کا حال میرؔ نے لکھا ہے۔

لاہور کا سفر

فرخ سیر کے زمانے میں ایک شخص نے نئی طرح کا دعویٰ کیا تھا وہ خود کو بیگوک کہلاتا تھا اور اس کا فلسفہ یہ تھا کہ ہر نبی کے ۹ بیگوک ہوتے ہیں میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری بیگوک ہوں۔ اُس نے اپنے عقیدتمندوں کی بھیڑ بھی اکٹھا کر لی تھی اور اپنا نام "خفشاں نمود" رکھا تھا۔ اس کے مُرید" فربُود" کہلاتے تھے۔ اِسی طرح کے مہمل الفاظ جوڑ کر اس نے ایک کتاب بھی تیار کر لی تھی جسے "اقوزۂ مقدّس" کہا جاتا تھا۔ اس کی شہرت ہوئی تو بعض اُمرا بھی اُسے دیکھنے جاتے تھے۔ ایک دن خود فرخ سیر بھی قدمبوسی کے لیے پہنچ گیا تھا۔ جب یہ فتنہ خوب پھیلنے لگا تو محمد علی کی غیرتِ ایمانی کو جوش آیا اور ایک دن اچانک لاہور کے لیے روانہ ہو گئے۔ کچھ زادِ راہ بھی ساتھ نہیں لیا۔ لاہور پہنچ کر اُس سے مناظرہ و مکالمہ ہوا۔ مگر میرؔ نے اس کی مبہم سی رپورٹ دی ہے کہ وہ لاہور میں دریائے راوی کے کنارے ایک بارہ دری میں رہتا تھا۔ فارسی نما کچھ مہمل فقرے بولتا تھا جنھے اس کے مُرید اور حواری سمجھتے تھے دوسرے لوگ اس کی ریاکاری کو نہیں پرکھ سکتے تھے کہتا تھا کہ میں دینِ محمدیؐ کی تائید کر رہا ہوں۔ میرؔ کے والد نے یہ سن کر کہا کہ ہمارے پیغمبر کا دین تجھ ایسوں کی تائید کا محتاج نہیں ہے۔ ذرا سوچ سمجھ کر بات کر۔ میرے اور تیرے درمیان یہ تلوار رکھی ہے، ایسا نہ ہو کہ مارا جائے۔

اس سے یہ مناظرہ کرنے کے بعد محمد علی اپنی جائے قیام پر آئے تو وہ اگلے دن معذرت خواہ ہو کر آیا۔ اُنھوں نے کہا کہ تیرا معافی مانگنا بے فائدہ ہے کل تو کیا کھری کھری سنائی تھیں جو آج سناؤں گا جب تیری روسیاہی کا پردہ چاک ہو گیا تو اب معذرت کیسی ؟

محمد علی کی اس تلخ کلامی سے بڑی حد تک اس کی اصلاح بھی ہو گئی۔ مگر کیا "اصلاح" ہوئی یہ میر نے واضح نہیں کیا۔ یہ پُر فریب تحریک احمد شاہ کے زمانے تک چلتی رہی۔ جس طرح یکا یک لاہور کے لیے محمد علی نے رختِ سفر باندھا تھا ایسے ہی ان کی واپسی بھی عجلت میں ہوئی۔ لاہور سے ۱۰–۱۲ دن میں دہلی پہنچے یہاں شیخ عبدالعزیز عزت اکبرآبادی (متوفی ۱۰۸۹ھ/۱۶۷۸ء) کے بیٹے فخرالدین خاں (متوفی ۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء) کے گھر پر قیام کیا۔ ان سے کچھ رشتہ داری بھی تھی۔ ان کا خاندان شیخ صدیقی تھا۔ فخرالدین خاں نے بہت اعزاز و اکرام کے ساتھ رکھا۔ لوگ جوق در جوق زیارت کے لیے آتے تھے اور مُرید بھی ہوتے تھے۔ بقول میر" ان کے وضو کا پانی بطور تبرک لے جاتے اور مریضوں کو پلاتے تھے، اللہ کے فضل سے بیمار صحت یاب بھی ہو جاتے تھے"۔

محمد علی کی سیرت

میر نے اپنے باپ کی سیرت اور شخصیت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہایت رقیق القلب، شکستہ دل، سوختہ جان درویش دل ریش تھے۔ وہ اتنا روتے تھے کہ ہچکی بندھ جاتی تھی۔ جو آہ اُن کے دل سے نکلتی وہ آسمانوں کا جگر چیر جاتی۔ شہر بھر میں غلغلہ مچ گیا کہ ایک درویش کامل یہاں آیا ہوا ہے۔ امراء نے بھی ملاقات کی آرزو ظاہر کی مگر اُنھوں نے قبول نہ کیا اور

فرمایا کہ میں فقیر ہوں، آپ امیر، میرا آپ کا کیا تعلق ؟ امیر الامرا صمصام الدولہ نے بھی سابقہ تعلقات کا حوالہ دے کر التجا کی کہ مجھے دولتِ دیدار سے محروم نہ فرمائیے، اجازت دیجیے کہ یہ روسیاہ حاضر ہو کر قدم بوس ہو۔ والد نے تبسم کیا اور کہا " ملاقات کے واسطے مناسبت ضروری ہے۔ امید ہے کہ آپ مجھے معذور سمجھ کر میرے حال پر چھوڑ دیں گے۔ جب کثرتِ خلائق سے تنگ آ گئے تو ایک رات کو وسطِ شب میں اُٹھے اور تہجد کی نماز پڑھ کر شہر سے نکل گئے۔ لوگوں نے بہتیری تلاش کی مگر ان کی گردِ پا کو بھی نہ پا سکے۔

سیّد امان اللہ

دو تین دن میں اکبر آباد (آگرہ) سے تین منزل اُدھر، بیانہ میں وارد ہوئے جو سادات اور شرفا کی قدیم بستی ہے اور یہاں ایک مسجد میں قیام فرمایا۔ بیانہ میں ایک نوجوان سید زادہ نہایت حسین اور خوش رو نظر سے گذرا آپ نے اس پر ایک نگاہ ڈالی اور جذب کامل سے کھینچ بلایا۔ اس پری وش کی حالت ایسی بدلی کہ دیوانہ وار بیہوش ہو کر آپ کے قدموں میں گر پڑا۔ اس کے عزیز سمجھ گئے کہ لڑکے کی حالت درویش کی نظر کے اثر سے دگرگوں ہو گئی ہے۔ ان سے التجا کی کہ اس نوجوان کی حالت پر رحم فرمائیے۔ آپ نے تھوڑا سا پانی منگایا اور کچھ دعا پڑھ کر اس پر دم کیا جیسے ہی پانی حلق سے نیچے اترا وہ لڑکا ہوش میں آگیا۔ اور نہایت ادب سے دو زانو ہو کر بیٹھ گیا اور عرض کی : اگر آپ کچھ دن میرے مہمان رہیں تو عین بندہ نوازی ہو گی ورنہ یہ تو میں جانتا ہوں کہ جس عالم میں آپ ہیں وہاں ناز کا گذر بھی نہیں، بے نیازی ہی بے نیازی ہے۔" والد صاحب نے فرمایا کہ دوستی کی راہ سے دعوت قبول کرنے

میں کوئی مضائقہ نہیں تھا، لیکن میں پا برکاب ہوں۔ کل یہاں سے روانگی کا عزم ہے حاضرین نے کہا ہم آپ کی مرضی کے تابع ہیں، اصرار کرنا بے ادبی ہوگی، لیکن اتنا ضرور ہے کہ اگر آپ اس لڑکے کے گھر تشریف لے چلیں اور کچھ تناول فرمائیں تو آپ کی عنایت سے بعید نہ ہوگا۔"

چونکہ شہر کے عمائد و اکابر کی درخواست کا پاس تھا فرمایا: "اچھا منظور ہے۔ لیکن فقیر کا دل کبھی شاد رہتا ہے کبھی ملول۔ کوئی ہمارے حال سے تعرض نہ کرے۔" لوگوں نے کہا: "ہماری کیا مجال ہے اور کسے یہ گوارا ہوگا کہ حضور کے خلافِ مزاج کوئی بات ظہور میں آئے۔ اور یہ سعادت شقاوت میں بدل جائے۔" غرض ان لوگوں کے ساتھ لڑکے کے گھر تشریف لے گئے اور وہاں کچھ کھانا بھی تناول فرمایا۔

اتّفاق سے اسی رات اس لڑکے کی شادی تھی۔ تھوڑی رات گئے وہ لڑکا کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ حضور بھی قدم رنجہ فرما کر محفل شادی کی رونق افزائی کریں تو ہمارے لیے فخر کا مقام ہوگا۔ فرمایا۔" مبارک ہو مگر افسوس کہ شادی خدا پرستی کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے۔"

یہاں میر محمّد علی نے اپنا ترک و تجرید کا نظریہ پیش کیا ہے۔ خود اُنھوں نے دو شادیاں کیں اور دونوں سے اولاد بھی ہوئی۔ لیکن سیّد امان اللہ سے اُنھوں نے کہا کہ" میں تو آزاد طبع آدمی تھا اس جال سے برقِ تیز رفتار کی طرح نکل گیا۔" اس سے خیال ہوتا ہے کہ اس وقت میر کی والدہ بھی گذر چکی ہوں گی لیکن میرہی کے ایک جملے سے آگے چل کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کی ماں زندہ تھیں۔

محمّد علی نے بیانہ کے اس سیدزادہ امان اللہ کو ایسا متاثر کیا کہ وہ شادی کے معًا بعد اپنی نو بیاہتا بی بی کو تنہا چھوڑ کر اِن کی تلاش میں جنگل بیابان کی خاک چھانتے ہوئے آگرہ پہنچے اور خاصی

پریشانی وسرگردانی کے بعد محمد علی کا اتا پتا معلوم کر کے ان کے تکیے میں آ گئے پھر یہیں مستقل طور سے رہنے لگے۔ میر اس وقت کمسن بچے تھے۔ امان اللہ انھیں اپنے ساتھ رکھتے تھے اور میر انھیں چچا کہتے تھے۔ ان سے اتنے مانوس ہو گئے تھے کہ اپنے ماں باپ سے زیادہ ان کی صحبت میں جی لگتا تھا۔ سید امان اللہ کو درویشوں سے ملاقات کرنے کا شوق تھا اور وہ میر کو بھی اپنے ساتھ درویشوں کی خدمت میں لے جاتے تھے۔ ایسی چند ملاقاتوں کا حال میر نے لکھا ہے۔ میر نے ان سے ابتدائی تعلیم بھی حاصل کی اور قرآن شریف ناظرہ بھی انھیں سے پڑھا۔

سید امان اللہ بھی اپنے مرشد کی طرح عشق مجازی کے اداشناس تھے۔ ایک دن جمعہ بازار کی سیر کے لیے گئے تو وہاں ایک روغن فروش نوجوان کی محبت میں بے قابو ہو گئے آخر اس پر حضرتِ عشق کا غلبہ ہوا اور کچھ دن بعد وہ بھی خانقاہ میں آکر ان کا مرید ہو گیا۔

احسان اللہ

آگرہ میں اس وقت ایک درویش احسان اللہ تھے ان سے ملنے کے لیے سید امان اللہ ہر ہفتہ جایا کرتے تھے۔ میر بھی اکثر ساتھ ہوتے تھے۔ آگرے میں عیدگاہ کے اُس پار ایک محلہ "فقیر کا تکیہ" تھا وہاں اُن کا صاف ستھرا، بلند چار دیواری کا مکان تھا۔ احسان اللہ گوشہ نشین تھے، اور کسی سے ملتے نہیں تھے۔ مگر امان اللہ کو باریابی ہو جاتی تھی۔ میر اُن کی خدمت میں گئے تو انھوں نے امان اللہ سے پوچھا یہ بچہ کس کا ہے؟ چچا نے کہا علی متقی کا لڑکا، اور میرا گود پالا ہے۔ فرمایا: "یہ بچہ ابھی کم سن ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے، اگر اس کی تربیت ڈھنگ سے ہو گئی تو ایک ہی جست میں آسمان سے بھی پرے

پہنچے گا۔ اس سے کہو کہ درویشوں کی ملاقات کو اپنا معمول بنائے فقیروں کی صحبت بڑی بابرکت ہوتی ہے۔"
پھر انھوں نے سوکھی روٹی کا ایک ٹکڑا پانی میں بھگو کر میرؔ کو کھانے کے لیے دیا جس کے بارے میں اُن کا
بیان ہے کہ "میں نے ایسی لذیذ غذا کبھی نہیں کھائی۔ مجھے اب تک اس کا ذائقہ یاد ہے۔" میر نے احسان اللہ
کے کچھ ملفوظات بھی لکھے ہیں۔ مثلاً انھوں نے فرمایا:

"اے عزیز جب سے عشق نے مجھے ٹھکانے لگایا ہے اور محبّت کا نقش میرے
دل میں بیٹھا ہے کوئی چیز نظر میں نہیں جچتی اور دل کو دنیا سے قطعًا لاگ نہیں رہی
ہے۔ تجرّد پیشہ ہوں، بے اندیشہ ہوں۔ اگر سارا عالم درہم برہم ہو جائے تو بھی میری
جمعیّت خاطر پراگندہ نہ ہوگی اگر آسمان بھی زمین پر گر پڑے تو بھی میرا دل منتشر نہ ہوگا۔
جب آنکھیں بند کرتا ہوں تو اس کا جلوہ دیکھتا ہوں جو سورج مکھی سے زیادہ نازک
ہے کہ نگاہ گرم کی تاب بھی نہیں رکھتا اور جب سر بگریباں ہوتا ہوں اس کا تماشائی
بن جاتا ہوں جس کا جلوہ برق سے ہزار درجہ شوخ تر ہے یعنی ایک پل کے لیے
بھی میرے دل کو تسلّی نہیں دیتا۔ میرا محشر خرام محبوب اگر رفتار میں آوے تو عالم کو
تہ و بالا کر دے۔ میرا بلند و بالا دلبر کھڑا ہو تو قیامت برپا کر دے۔ تم اگر اس کے
کوچے کی خاک بن جاؤ تو سب سروں کے تاج بن جاؤ۔ اس کے پایمال بنو
تاکہ اہلِ نظر کی آنکھوں کا سرمہ بن سکو ایسا دل لاؤ جسے وہ پسند کرتا ہے۔ ایسی جان
پیدا کرو جو اس سے واصل ہو جاتے کسی اپنے سے بہتر کے ہاتھ میں ہاتھ دے دو
کیونکہ اس طرح یہ دور دراز راستہ آسان ہو جاتا ہے۔"

"اے یارِ عزیز۔ دل اگر غمگین ہے تو مبارک ہے۔ غم اگر دل گداز ہے تو اچھا ہے درویش دلِ محزوں تلاش کرتے ہیں نہ کہ شایستۂ طرب۔ اور درد مند جان چاہتے ہیں نہ کہ درماں طلب۔ روئے نیاز اس کی طرف رکھو جو بے نیاز ہے سب کام اُسے سونپ دو جو کارساز ہے۔ گوشہ نشیں ہو جاؤ اور توکّل کرو۔ اپنے اندر کھو جاؤ اور غور و تامّل کرو۔ اگر جان میں نیاز مندی پیدا ہو جائے تو عنقا ہے۔ دل اگر گداز ہو جائے تو کیمیا ہے۔

اے یارِ عزیز۔ وہ یکتا پیرہن معشوق جس رنگ میں چاہتا ہے نمودار ہو جاتا ہے۔ کبھی پھول ہے کبھی رنگ۔ کہیں لعل ہے کہیں سنگ۔ کچھ لوگ پھول سے جی خوش کر لیتے ہیں بعض رنگ سے عشق کرتے ہیں۔ ایک جماعت لعل کو معتبر جانتی ہے تو دوسری پتھر کو خدا مانتی ہے۔ خبردار۔ کہ یہ غور کرنے کا مقام ہے ایسی آنکھ ہونی چاہیے کہ ماسوا کی طرف نہ اُٹھے اور وہ دل درکار ہے جو اپنی جگہ سے نہ ٹلے۔ دشمن اور دوست سب اُسی سے ہیں کیونکہ دلوں پر اُس کا تصرّف ہے۔ ہدایت اور گمراہی دونوں اسی کے مظہر ہیں۔ مست اور ہشیار سب اسی کو ڈھونڈھتے ہیں۔ محراب اُس کی ابرو سے پیدا ہوتی ہے میخانہ اُس کی آنکھ سے ہویدا ہوا ہے۔ زاہدانِ مناجاتی عبادت و اطاعت کرتے ہیں رندانِ خراباتی جام لنڈھاتے ہیں۔ محراب میں سر جھکانا چاہیے اور خرابات میں رندانہ وضع سے آنا چاہیے۔ یعنی ہر موقع کی رعایت اور ہر مرتبے کا لحاظ ضروری ہے۔"

میرؔ کے نظریات تصوف، مشرب و مسلک اور انسان دوستی کا سرچشمہ انھیں باتوں میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ذکر میر میں درویشوں کی یہ حکایات اور ان کے ملفوظات تاریخی معیار پر خواہ کچھ بھی ہوں، چاہے اِن درویشوں کا تذکرہ سیر اولیا، کی کتابوں میں ملے یا نہ ملے، لیکن ان حکایتوں کے بین السطور میں میرؔ کے ذہن کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ یہی وہ باتیں ہیں جو ان کی شاعری میں صدائے بازگشت کی طرح گونج رہی ہیں۔

جس مجلس میں یہ ملفوظات ادا ہو رہے تھے میرؔ (جن کی عمر ۸ – ۹ سال سے زیادہ نہ ہوگی)، اپنے چچا سید امان اللہ کے ساتھ موجود تھے ان کا بیان ہے کہ شہر کے صوبیدار (گورنر) کا مصاحب آیا اور اس کی درخواست پیش کی کہ نصرت یار خاں قدمبوسی کے لیے حاضر ہو رہا ہے درویش احسان اللہ نے کہا کہ وہ کتنی بار ناکام واپس ہوا ہے اب مجھے اس سے شرم آتی ہے۔ اگر اس بار بھی ناکام واپس ہو گیا تو خدا جانے پھر ملاقات ہو یا نہ ہو۔ اُسے باریابی دی گئی۔ وہ ہاتھی سے اتر کر آیا اور قدمبوس ہوا۔ پھر پانچ اشرفیاں نذر کیں۔

یہاں ایک شبہ یہ ہوتا ہے کہ نصرت یار خاں (جس کا پورا نام ہدایت اللہ رکن الدولہ سیّد نصرت یار خاں بہادر ہے) سادات بارہہ میں سے تھا اور عہد فرخ سیر کے بڑے امرا میں اس کا شمار ہوتا ہے اس نے ۱۱۳۴ھ/۱۷۲۱ء میں انتقال کیا اس وقت تک میرؔ پیدا بھی نہ ہوئے تھے۔ لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ میرؔ کو صوبیدار کا صحیح نام یاد نہ رہا ہو۔

بہرحال صوبیدار کی نذر دی ہوئی پانچ اشرفیاں احسان اللہ کے لیے موت کا سامان بن گئیں۔ اِدھر صوبیدار رخصت ہوا اُدھر ایک گویّے کا لڑکا اس طرف سے گذرا۔ فقیر کی نظر اس پر پڑی۔

بے اختیار ہو گئے۔ امان اللہ سے فرمایا کہ اس کو یہاں بلاؤ۔ وہ آیا تو اس نے بھیرویں میں ایک غزل شروع کی۔ درویش کو وجد آگیا۔ انھوں نے اس سے کہا کہ آج رات فقیر کے ساتھ بسر کرو اور جو چیزیں تمھیں یاد ہوں سناؤ۔

دن ڈھلے انھوں نے سیّد امان اللہ اور میر کو رخصت کر کے دروازہ بند کر لیا گویّے نے وہ پانچ اشرفیاں دیکھ لی تھیں۔ دودھ لانے کے بہانے سے باہر گیا اور دودھ میں زہر ملا کر لے آیا۔ بہت اصرار کر کے وہ پیالہ درویش کو پلا دیا۔ دودھ پیتے ہی درویش کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ اور وہ لڑکا اشرفیاں لے کر چمپت ہو گیا۔ صبح تک ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ وہیں فقیر کے تکیے میں دفن کیے گئے۔ میر لکھتے ہیں کہ اب تک وہ جگہ زیارت گاہ خلائق ہے۔

بایزید درویش سے ملاقات

آگرے کے ایک اور مجذوب صفت فقیر بایزید نامی تھے۔ ان کی خدمت میں بھی سیّد امان اللہ جایا کرتے تھے۔ یہ سرائے گیلانی کے ایک شکستہ حجرے میں رہتے تھے۔ "نہایت مستغنی، گویا فرشتہ اس دنیا میں آگیا ہے۔ نہیں، نہیں، جان آدم سے زیادہ عزیز۔ پتھر کا تکیہ، خاک کا بچھونا۔ ہر وقت ہلاک ہونے پر آمادہ، شکستہ دل، کشادہ رو، سوختہ جان، دلدادہ، خاک افتادہ، متوکل اور مقصود دلی سے بہرہ مند۔"

ایک بار میر بھی اپنے چچا کے ساتھ بایزید سے ملنے گئے۔ درویش نے بڑی عنایت اور شفقت سے استقبال کیا اور اپنے سامنے بٹھایا۔ میر کے بارے میں پوچھا تو سیّد امان اللہ نے بتایا

کہ یہ علی متقی کا فرزند ہے۔ فرمانے لگے: "اوہ پھر تم سے کیا پوچھنا۔ اس بچے کے والد تو بڑے دانائے اسرار بزرگ ہیں۔ وہ آسمان درویشی کے خورشید، مشہورِ جہاں، بلکہ جان درویشی ہیں ایسا دریا ہیں جس کی تہ سے قیمتی موتی نکلتے ہیں۔ ہم فقیر تو بے مایہ ہیں ہم سے کیا بن پڑتا ہے؟"

پھر بایزید نے عشق و معرفت میں ڈوبی ہوئی درویشانہ باتوں سے امان اللہ کو مخاطب کیا ان کے ملفوظات بھی میرؔ نے لکھے ہیں۔ بایزید کا مسلک بھی وہی مسلکِ عشق ہے۔ جو احسان اللہ اور علی متقی کا ہے۔

تیسری بار میرؔ ان کی خدمت میں پہنچے تو بایزید کو بیمار پایا۔ ایک پہلو سے جھکے ہوئے کراہ رہے تھے۔ اور ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہے تھے۔ اسی عالم میں ان کا انتقال ہو گیا۔ امان اللہ نے ان کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔ بایزید کے انتقال کا امان اللہ کو مدّت تک صدمہ رہا۔

اب میرؔ کے والد کی عمر ساٹھ سال کی ہو چکی تھی۔ ایک دن انھوں نے امان اللہ سے کہا کہ دماغ روز بروز ضعیف ہوتا جاتا ہے اسے اگر قرآن شریف حفظ کرنے میں لگا دیا جائے تو کیسا ہے؟ انھوں نے کہا کہ یہ بہت اچھی بات آپ کے خیال میں آئی۔ چنانچہ حفظ شروع کیا اور ڈیڑھ سال کی مدّت میں حافظ بھی ہو گئے۔ ان کے بڑے بیٹے محمد حسن بھی حافظِ قرآن تھے۔

اسد اللہ

ایک دن محمد علی عرف علی متقی اور امان اللہ بیٹھے ہوئے قرآن شریف کا دورہ کر رہے تھے کہ اسد اللہ نامی ایک درویش نیلا لباس پہنے اور نمدی ٹوپی اوڑھے وارد ہوئے۔ معلوم ہوا کہ یہ اور

علی متقی ایک ہی پیر کے مرید ہیں۔ ایک بار علی متقی نے اپنے پیرو مرشد سے کہا تھا کہ کیا ہی اچھا ہو اگر موت کے آثار مجھ پر پہلے سے ظاہر ہو جائیں تاکہ آخرت کی تیاری میں ہمہ تن مشغول ہو جاؤں اور دوسری باتوں میں دل نہ لگاؤں۔ مرشد نے کہا تھا کہ جب تم کبود جامہ کے اس تاجر اسد اللہ کو دیکھو تو جان لینا کہ آیندہ سال تک زندہ نہ رہو گے۔ یہ سن کر امان اللہ کو بہت صدمہ ہوا اور انھوں نے اپنے مرشد علی متقی سے کہا کہ ان شاء اللہ میں یہ صدمہ اٹھانے کے لیے زندہ نہ رہوں گا۔

اسد اللہ ایران کے ایک چھوٹے سے گانو کبود جامہ میں نہاری اور پائے پکا کر بیچا کرتے تھے۔ وہاں انھوں نے اپنے مرشد (شیخ کلیم اللہ اکبرآبادی) کو خواب میں دیکھا کہ انھیں آگرہ جانے کا حکم دے رہے ہیں۔ یہ اتنا دور دراز کا سفر طے کر کے یہاں پہنچ گئے۔

امان اللہ کی وفات

اسی سال عید آئی۔ امان اللہ نئے کپڑے پہن کر نماز دوگانہ پڑھنے گئے۔ واپس آئے تو سینے میں درد شروع ہو گیا اور اتنا شدید ہوا کہ چہرے کا رنگ بدل گیا۔ چند ہی روز میں حالت دگرگوں ہو گئی اور امان اللہ نے اس جہان فانی سے کوچ کیا۔

علی متقی کو اپنے چہیتے مرید اور خلیفہ کی وفات کا سخت صدمہ ہوا۔ اور انھوں نے اپنا لقب "عزیز مردہ" رکھ لیا۔ خود میر بھی اس حادثے سے بہت متاثر تھے۔ لکھتے ہیں کہ "میں جو مرحوم چچا کا گودوں پالا تھا اور اپنی ساری ضرورتوں کو ان سے کہتا تھا انھیں کے ساتھ سوتا اور رکھا تا تھا اب دن بھر انھیں یاد کرتا اور رات بھر آنسو بہاتا۔ درویش (والد) ہر طرح میری دلجوئی کرتے اور کبھی مجھے آزردہ

نہ ہونے دیتے۔ کبھی کہتے کہ "بیٹے میں تمھیں بہت چاہتا ہوں مگر اس غم سے گھلا جاتا ہوں کہ میں بھی بر سرِ راہ ہوں"۔ کبھی فرماتے : "میرے چاند، اب تم گود کے بچّے تو نہیں ہو، خدا کا شکر ہے کہ دس سال کے ہوگئے کیوں جی کڑھاتے ہو، آخر درویش زادے ہو۔ دل مضبوط رکھو۔ اپنے تئیں خدا کو سونپ دو"۔

احمد بیگ ولایتی

علی متقی کے اسی آخری زمانے میں ایک ولایتی احمد بیگ نام آگرہ آیا اور سات مہینے تکیہ میں رہ کر ریاضات و مجاہدات میں مشغول رہا۔ علی متقی نے اُسے کلاہ و سجادہ اور سفر خرچ دے کر حج کے لیے روانہ کیا۔

ایک دن وہ اپنے بھانجے محمد باعث کی عیادت کے لیے آگرے کے محلّہ عالم گنج کی طرف گئے۔ شام کو واپسی ہوئی تو طبیعت خراب تھی سر میں درد تھا، اور تیز بخار چڑھا ہوا تھا اپنے پرانے معالج حکیم ابوالفتح کو بلایا انھوں نے ٹھنڈائی پلائی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا اور بخار ٹھہر گیا یعنی روز شام کو چڑھتا اور صبح تک رہتا تھا۔ بہت دنوں کے بعد یہ تشخیص ہوا کہ وہ تپ دق میں مبتلا ہیں۔

والد کا انتقال

امان اللہ نے شوال ۱۱۴۵ھ یعنی مارچ ۱۷۳۳ء میں انتقال کیا اور اس کے بعد احمد بیگ کا آنا اور سات ماہ تک رہ کر ریاضت کرنا بھی میر کی تحریر سے ظاہر ہے شوال سے ربیع الثانی ۱۱۴۶ھ تک یہ سات ماہ پورے ہوتے ہیں۔ علی متقی نے ۲۰/ رجب ۱۱۴۶ھ (۱۶/ دسمبر ۱۷۳۳ء)

کو انتقال کیا۔ اس وقت میرؔ کی عمر گیارہ سال رہی ہوگی ۔

حافظ محمد حسن

اپنے آخری دنوں میں علی متقی نے میرؔ کے سوتیلے بڑے بھائی حافظ محمد حسن کو بلایا اور ان سے کہا کہ میں فقیر آدمی ہوں میرے پاس کچھ اثاثہ نہیں ہے بس تین سو کتابیں ہیں وہ میرے سامنے لاؤ اور بھائیوں میں تقسیم کرلو۔ محمد حسن نے کہا کہ میں طالب علم ہوں اور میرا کتابوں سے بیشتر واسطہ رہتا ہے۔ یہ چھوٹے بھائی کتابوں سے کوئی ربط ہی نہیں رکھتے ان کے ورق پھاڑ ڈالیں گے ۔ ایک پتنگ بناکر اڑا دے گا دوسرا ناؤ بناکر پانی میں بہا دے گا اگر آپ یہ سب کتابیں مجھے ہی سونپ دیں تو اچھا ہے ۔ میرؔ کہتے ہیں کہ والد کو ان کی بدنیتی کا اندازہ تھا انھیں ڈانٹا اور کہنے لگے اس سے کیا ہوتا ہے جو تو نے فقیروں کا سا بھیس بنا لیا ہے، تیری مکاری اور حیلہ سازی تو ابھی تک گئی نہیں۔ تو چاہتا ہے کہ ان بچوں سے دغا کرے اور میری آنکھیں بند ہونے کے بعد انھیں نقصان پہنچائے یاد رکھ کہ اللہ تعالیٰ غیور ہے اور غیور کو پسند کرتا ہے۔ غالب ہے کہ میر محمد تقی تیرا دست نگر نہ ہوگا ۔ اگر تو اس کے ساتھ دوسری طرح پیش آئے گا تو نیچا جھانکے گا۔

پھر علی متقی نے میرؔ سے کہا کہ میں بازار کے بنیوں کا تین سو روپے کا مقروض ہوں، امید ہے جب تک قرض ادا نہ کردو گے میرا جنازہ نہ اٹھاؤ گے کیونکہ میں معاملے کا صاف رہا ہوں اور تمام عمر کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ میرؔ نے کہا کہ سوائے ان کتابوں کے کوئی اثاثہ نظر نہیں آتا اور وہ بھی آپ نے بڑے بھائی کو سونپ دیں۔ اب میں قرض کہاں سے ادا کروں گا۔ والد کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور

فرمانے لگے : مایوس نہ ہونا چاہیے خدا کریم ہے۔ ہنڈی راستے میں ہے پہنچا چاہتی ہے۔ چاہتا تھا کہ روپیہ آنے تک زندہ رہوں۔ لیکن عمر کے چند ہی لمحے باقی رہ گئے ہیں اب ٹھہرنا ممکن نہیں۔

والد کے انتقال سے سارا عالم میرؔ کی نظروں میں تاریک ہوگیا۔ گویا آسمان ٹوٹ پڑا۔ میرؔ کہتے ہیں کہ بڑے بھائی نے مروّت کو بالائے طاق رکھ کر توتا چشمی اختیار کرلی۔ سیّد مکمّل خاں سیّد امان اللہ کے مرید تھے اُن کا نوکر پانچ سو روپے کی ہنڈوی لے کر آیا۔ میرؔ نے تین سو روپے کا قرض ادا کیا اور سو روپے تجہیز و تکفین میں خرچ کرکے اپنے والد کو شاہ کلیم اللہ اکبرآبادی کے پہلو میں دفن کیا۔

دلّی میں آمد

اب میرؔ کے لیے آزمایشوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا۔ والد کے زمانے میں جو لوگ آنکھوں پر بٹھاتے تھے انھوں نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ سب سے بڑا مسئلہ معاش کا تھا۔ میرؔ ۱۱ - ۱۲ برس کے تھے دوسرا بھائی محمد رضی ان سے دو ڈھائی سال چھوٹا ہی ہوگا اسے گھر پر چھوڑ کر یہ روزگار کی تلاش میں گھوما کیے لیکن وہاں کوئی صورت نہ نکلی تو آگرے سے پہلی بار دہلی کا رخ کیا۔ یہاں بھی اتنے بڑے شہر میں ایک یتیم بچّے کو کون پہچانتا؟ آخر میرؔ کی ملاقات خواجہ محمد باسط سے ہوگئی یہ امیرالامرا نواب صمصام الدولہ خان دوراں خاں کے بھتیجے تھے۔ ان کی حویلی موجودہ ترکمان گیٹ اور دہلی دروازے کے درمیان تھی۔ ان کے والد خواجہ محمد عاصم عہد فرخ سیر میں میر آتش تھے۔ امیرالامرا حسین علی خاں کے دکن جانے کے بعد میر بخشی بنائے گئے تھے۔ خواجہ محمد باسط شاعر بھی تھے، باسطی تخلص تھا۔ صوفی منش اور علم دوست انسان تھے انھوں نے ۱۱۶۸ھ/۵۴-۱۷ء میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔

غرض خواجہ محمد باسط نے میرؔ پر یہ کرم کیا کہ انھیں اپنے چچا نواب صمصام الدولہ کی خدمت میں لے گئے۔ انھوں نے پوچھا کہ یہ کس کا لڑکا ہے تو بتایا گیا کہ میر محمد علی کا۔ فرمانے لگے کہ اس کے یہاں آنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دنیا سے گذر چکے ہیں۔ ان کی وفات پر افسوس کیا اور کہا کہ اُن کے مجھ پر بڑے حقوق ہیں ایک روپیہ روز میری سرکار سے اس بچّے کو دیا جائے۔

اس پر میرؔ نے عرض کیا کہ اگر یہ حکم دستخط فرما کر مجھے دے دیں تو متصدیوں کو چون و چرا کرنے کی گنجائش نہ رہے۔ یہ کہہ کر میرؔ نے پہلے سے لکھی ہوئی درخواست جیب سے نکالی اور دستخط کے لیے پیش کی۔ اس پر خواجہ محمد باسط نے کہا کہ یہ قلمدان کا وقت نہیں ہے یہ سن کر میرؔ نے ایک ٹھٹھا مارا۔ نواب نے ہنسی کا سبب پوچھا تو کہنے لگے کہ قلمدان ایک بے جان شئے ہے وقت اور غیر وقت نہیں جانتا، جب بھی حکم دیا جائے پیش ہو سکتا ہے انھیں یہ کہنا چاہیے تھا کہ قلمدان بردار حاضر نہیں' یا یہ نواب کے دستخط کرنے کا وقت نہیں۔ "قلمدان کا وقت نہیں" نئی ترکیب ہے۔ نواب ہنسنے لگے اور بولے کہ معقول بات کہتا ہے۔ اسی وقت قلمدان منگایا اور درخواست پر دستخط کر دیے۔

بعض ناقدوں نے اس پر شبہ کیا ہے کہ اتنے بڑے امیر کے دربار میں ایک ۱۱-۱۲ سال کا لڑکا قہقہہ مار کر ہنسے اور اپنے ایک بزرگ کی لفظی گرفت کرے۔ ہو سکتا ہے کہ اس واقعہ کی اصلیت کچھ نہ ہو۔ اس لطیفے کے پردے میں میرؔ نے یہ اشارہ کیا ہے کہ نواب صمصام الدولہ بہت معمولی پڑھے لکھے تھے بلکہ بعض مورخوں کا کہنا ہے کہ لکھنا جانتے ہی نہ تھے۔ فارسی کی معمولی شُدبُد رکھتے تھے۔ مگر اپنے زمانے میں بڑے بارسوخ اور دبدبہ والے امیر تھے۔

نادر شاہ کا حملہ

یہ وظیفہ ۴-۵ سال ملا ہوگا کہ ہندستان پر نادر شاہ نے چڑھائی کر دی (۱۷۳۹ء)، محمد شاہ اپنی فوج لے کر مقابلہ کرنے کے لیے کرنال تک گیا۔ صمصام الدولہ پیچھے کمک لے کر روانہ ہوئے۔ ۱۳ر فروری ۱۷۳۹ء کو گھمسان کا رن پڑا، اس میں صمصام الدولہ بری طرح زخمی ہوتے انھیں زخموں نے ۱۷ر فروری ۱۷۳۹ء کو ۶۸ سال کی عمر میں اُن کی جان لے لی۔ وہ درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء کے شمال مغرب میں ایک چھوٹی سی مسجد میں مدفون ہیں۔ ۹ر مارچ ۱۷۳۹ء کو نادر شاہ فتح وظفر کے نقارے بجاتا ہوا دلّی میں داخل ہوا۔ ۱۱، ۱۲، ۱۳ مارچ کو یہاں قتلِ عام کیا، جس میں تیس ہزار سے زائد انسان قتل ہوئے۔ ۵ر مئی کو ۵۸ دن دلّی میں قیام کرنے کے بعد اس حالت میں رخصت ہوا کہ آٹھ مغل تاجداروں کے جمع کیے ہوئے خزانے اس کی مٹھی میں تھے۔ ایک اندازے کے مطابق ۷۰ — ۸۰ کروڑ کی مالیت کا سونا، چاندی، ہیرے، جواہرات اور زرنقد وہ اپنے ساتھ لے گیا جو دس ہزار اونٹوں، دس ہزار گھوڑوں اور تین ہزار جنگی ہاتھیوں پر لادا گیا تھا۔ اس حملہ نے فوجی اور معاشی اعتبار سے مغل حکومت کی کمر توڑ دی۔

دوبارہ دلّی میں

صمصام الدولہ کی شہادت سے میرؔ کا وظیفہ بھی بند ہو گیا۔ آگرے میں کوئی پُرسان حال نہیں تھا مجبوراً دوبارہ دلّی کا رُخ کیا۔ یہاں فارسی کے مشہور شاعر اور ماہر علم اللغۃ سراج الدین علی خان آرزو

(۱۶۸۹ ـ ۱۷۵۵ء) محلہ وکیل پورہ میں رہتے تھے یہ میر کی سوتیلی ماں کے بھائی تھے میر کا قیام انھیں کے گھر پر رہا۔ یہاں انھوں نے خان آرزو سے فارسی زبان سیکھی اگرچہ اس کا کھلے لفظوں میں اقرار کہیں نہیں کیا صرف ایک موقع پر "استاد و پیر و مرشد بندہ" لکھا ہے لیکن ان کے معاصرین بھی اس کی گواہی دیتے ہیں کہ میر کی فارسی دانی خان آرزو کی مرہون منت ہے۔

میر کی تعلیم

میر کا بیان ہے کہ جب انھوں نے چند کتابیں "یاران شہر" سے پڑھ لیں اور کسی قابل ہوئے تو آگرہ سے حافظ محمد حسن نے اپنے ماموں خان آرزو کو خط لکھا کہ "میر محمد تقی فتنہ روزگار ہے اس کی تربیت ہرگز نہ کرنی چاہیے بلکہ دوستی کے پردے میں کام تمام کر دینا چاہیے۔"

خان آرزو اپنے بھانجے کے بہکانے میں آگئے اور میر سے دشمنی کا برتاؤ شروع کر دیا۔ ذرا ذرا سی بات پر ڈانٹتے پھٹکارتے اور ہمہ وقت کڑی نگرانی رکھتے تھے۔

جنون کا حملہ

اسی زمانے میں میر کو شدید گھٹن اور ذہنی پریشانی کے باعث جنون ہو گیا۔ اپنی کوٹھری کا دروازہ بند کیے پڑے رہتے تھے۔ شاید کچھ جارحیت بھی پیدا ہو گئی تھی اس لیے گھر والے اِن کے قریب نہ آتے تھے۔ رات کو جب چاند نکلتا تو جنون زیادہ ہو جاتا تھا۔ خود ان کا بیان ہے:

"چاندنی رات میں ایک حسین پیکر اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ کرۂ قمر سے میری

طرف آتا اور مجھے بے خود کر دیتا تھا جدھر بھی آنکھ اٹھتی اسی رشک پری پر پڑتی تھی جس طرف دیکھتا اسی غیرتِ حور کا تماشا کرتا۔ میرے گھر کے در و بام اور صحن گویا ورق تصویر ہو گئے تھے۔ یعنی ہر سمت وہی حیرت افزا چہرہ نظر آتا۔ کبھی چودھویں کے چاند کی طرح سامنے۔ کبھی سیر گاہ دل میں محو خرام۔ اگر گل مہتاب پر نظر پڑ جاتی تو جان اور بھی بے قرار ہو جاتی۔ ہر رات اس پری پیکر سے ملاقات ہوتی اور ہر صبح اس کی جدائی میں وحشت۔ جب سفیدۂ سحر نمودار ہوتا دل سے ٹھنڈی آہیں نکلنے لگتیں۔ یعنی دل مچلتا اور چاند کی طرف لپکتا۔ تمام دن یہی جنون سوار رہتا اور دل اس شکل مہتابی کی یاد میں خون ہوتا۔ میں دیوانہ و مست کے مانند منھ میں کف بھرے ہوئے، ہاتھوں میں پتھر لیے گرتا پڑتا اور لوگ مجھے دیکھ کر بھاگتے۔" (آپ بیتی ۹۵)۔

یہ کیفیت چار مہینے تک رہی۔ فخر الدین خاں (جن کے گھر پر علی متقی نے لاہور سے واپسی میں قیام کیا تھا)، کی بیوی نے جو علی متقی کی مرید تھیں اور قریبی رشتہ بھی رکھتی تھیں میر کے علاج پر بہت روپیہ خرچ کیا۔ اس سے طبیعت رو باصلاح ہو گئی۔ پریشاں گوئی موقوف ہوئی۔ دماغ کی تری کے لیے دوائیں استعمال کیں تو نیند بھی آنے لگی اور کچھ دنوں میں بالکل تندرست ہو گئے۔ میرا خیال ہے یہ جنونی کیفیت کسی عشق کا ثمرہ تھی اور جس شکل مہتابی کا میر نے تذکرہ کیا ہے وہ خان آرزو کے خاندان کی کوئی لڑکی رہی ہوگی جس کا نام چاندنی، مہتاب یا قمر ہو سکتا ہے۔ اسی کا نام لے کر میر راتوں کو پکارتے تھے اور اسی کیفیت کی صدائے بازگشت ان کی شاعری میں بھی ملتی ہے۔

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھے ہو   ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا ؟

میرؔ نے اس جنون کی کیفیت کو اپنی مثنوی "خواب و خیال" میں نظم کیا ہے۔

میر جعفر عظیم آبادی

عالم جنون خدا خدا کر کے گذرا تو اب اُنھوں نے ترسلات (یعنی فارسی انشا پردازی) کی کتابیں پڑھنی شروع کر دیں۔ اسی زمانے میں ایک دن کسی کتاب کے متفرق اوراق ہاتھ میں لیے ہوئے بازار میں بیٹھے تھے کہ اُدھر سے میر جعفر عظیم آبادی کا گذر ہوا اُنھوں نے کہا ایسا معلوم ہوتا ہے تمھیں پڑھنے کا شوق ہے۔ میں بھی کتاب کا کیڑا ہوں اگر تم چاہو تو کبھی کبھی آ کر تمھیں پڑھا دیا کروں گا۔ میرؔ نے کہا کہ اس سے اچھی کیا بات ہے۔ "مگر میری مالی حالت ایسی نہیں ہے کہ آپ کی کچھ خدمت کر سکوں اگر محض خدا واسطے یہ زحمت گوارا کریں تو عین بندہ نوازی ہوگی۔" میر جعفر نے کہا کہ مجھے زیادہ کچھ نہیں چاہیے البتہ اتنا ضرور ہے کہ تھوڑا سا ناشتہ مل جایا کرے۔ میرؔ کے پاس اتنا بھی انتظام نہیں تھا۔ مگر اُنھوں نے وعدہ کر لیا کہ اللہ مالک ہے۔ میر جعفر آتے رہے اور اُنھوں نے بڑی تن دہی سے میرؔ کو فارسی پڑھائی۔ پھر اچانک اُن کے وطن عظیم آباد (پٹنہ) سے بُلاوا آ گیا اور وہ اُدھر چلے گئے۔

سیّد سعادت علی

اب اتنا ہو گیا تھا کہ میرؔ کو فارسی زبان میں لکھنے کی قدرت حاصل ہو گئی۔ طبیعت حسّاس اور درّاک تھی۔ ماحول میں شعر و شاعری کا چرچا تھا اُنھوں نے بھی فارسی میں شعر لکھنا شروع کر دیے اور خاصی مشق بہم پہنچالی۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اُن کی ملاقات سیّد سعادت علی سعادتؔ امروہوی سے

ہوگئی جنھوں نے میرؔ کی فنّی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ کر کے اُنھیں ضائع ہونے سے بچا لیا اور ٹھیک راستے پر لگا دیا۔ جس طرح سعداللہ گلشن نے ولیؔ دکھنی کو ریختہ میں شعر کہنے کا مشورہ دیا تھا، اسی طرح سعادتؔ امروہوی نے میرؔ سے کہا کہ وہ کیوں فارسی میں اپنی صلاحیت برباد کر رہے ہیں۔ ایرانی انھیں مستند ماننے سے رہے، نہ اُن کی شاعری کو خاطر میں لائیں گے۔ پھر فارسی کا رابطہ عوام سے بھی نہیں ہے یہ خواص کی زبان ہے۔ اس لیے انھیں چاہیے کہ اردوے معلّی کی زبان میں شاعری کریں تاکہ اُن کی شاعری کو قبولیتِ عامّہ حاصل ہو۔ میرؔ نے اس مشورے کو گرہ میں باندھ لیا اور اردو میں شعر کہنا شروع کر دیا، اس کو قبول کرنے کے لیے سارا ماحول پہلے ہی سے تیّار تھا، تھوڑے ہی دنوں میں ان کے اشعار بچّے بچّے کی زبان پر چڑھ گئے اور گلی کوچوں میں پڑھے جانے لگے۔ وہ خود لکھتے ہیں۔

> "کچھ دنوں بعد سعادت علی نام کے ایک سیّد سے میری ملاقات ہوئی جو امروہہ کے رہنے والے تھے اور اُنھوں نے مجھے ریختہ میں شعر کہنے کی ترغیب دی جو شعر فارسی کی طرح قلعہ شاہی کی زبان میں شاعری ہے اور اس وقت بہت رواج پا رہی تھی۔ میں نے بھی بہت محنت کی اور اپنی مشق اتنی کر لی کہ شہر کے شاعروں میں مستند سمجھا جانے لگا۔ میرے اشعار گلی کوچوں میں پڑھے جانے لگے اور ادنیٰ و اعلا کے کانوں تک پہنچ گئے۔" (میرؔ کی آپ بیتی ۹۸)

یہاں سیّد سعادت علی کا تھوڑا سا تعارف کرا دیا جائے۔ یہ امروہہ کے محلہ حقّانی میں رہتے تھے۔ دلّی آکر قلعہ شاہی میں ملازم ہوئے۔ حضرت شاہ شرف الدّین سہروردیؒ ولادت غالباً ۶۶۳ھ/۱۲۶۴ء، کی اولاد میں تھے جو "شاہ ولایت" کہلاتے ہیں جب مشہور سیّاح ابن بطوطہ امروہہ پہنچا ہے تو ان

کا آخری زمانہ تھا۔امروہہ کے بیشتر سادات نقوی اِنھیں کی اولاد میں ہیں۔عہد اکبری کے میر عدل سید محمد بھی اِن کے اخلاف میں سے تھے۔ سعادت اپنے زمانے میں نہایت ممتاز شاعر تھے اور اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔اُنھوں نے اپنا دیوان ریختہ بھی مرتب کیا تھا جس کا پہلا شعر یہ تھا۔

واللہ جو سر لوح ترا نام نہ ہوتا
ہر گز کسی آغاز کو انجام نہ ہوتا

ان کے مراثی اور مناقب و سلام بھی اُس زمانے میں مقبول تھے۔ایک داستانِ عشق بھی سیلی سجنوں (بروزن لیلی مجنوں) لکھی تھی۔اب ان کے صرف ۱۷۔اردو اشعار دستیاب ہوتے ہیں۔تقریباً چالیس سال کی عمر میں تپِ محرقہ کے آزار میں مبتلا ہو کر انتقال کیا۔

نواب رعایت خاں کی ملازمت

۱۱۶۰ھ (۱۷۴۷ء) میں ایک دن خان آرزو نے میر کو کھانے پر بُلایا اور کسی بات پر بہت بُری طرح ڈانٹا۔ یہ بہت کُڑھے اور کھانا کھائے بغیر اٹھ گئے۔ باہر نکل کر یوہیں جدھر کو مُنھ اُٹھ گیا چل دیے اور حوض قاضی پر آ نکلے جو نواب قمرالدّین خاں وزیر کی حویلی کے پاس تھی اور اس نام سے دلّی کا ایک محلّہ آج بھی موجود ہے۔ یہاں میر پانی پی رہے تھے کہ ایک شخص علیم اللہ سامنے آئے اور کہنے لگے کیا تم میر تقی ہو؟ انھوں نے کہا کہ ہاں۔مگر آپ نے کیسے پہچانا؟ وہ بولے کہ تمھاری سودائیانہ وضع تو سارے شہر میں مشہور ہے۔ نواب قمرالدّین خاں کے داماد نواب رعایت خاں نے جب سے تمھارے اشعار سنے ہیں وہ تم سے ملنے کا مشتاق ہے۔ اگر تم میرے ساتھ نواب کے دربار میں

چلو تو میرے لیے بھی ملاقات کا ایک بہانہ ہو جائے گا۔ میرؔ آمادہ ہو گئے اور علیم اللہ کے ساتھ وہاں پہنچے۔ نواب بڑے اخلاق سے پیش آیا اور میرؔ کو اپنے مصاحبوں میں داخل کر لیا۔ اس طرح میرؔ کی پہلی ملازمت کا آغاز ہوا۔

میرؔ کا سفرِ سرہند

ابھی ایک سال بھی نہ گذرا تھا کہ احمد شاہ درّانی نے ہندستان پر حملہ کیا وہ ۸ جنوری ۱۷۴۸ء کو لاہور پہنچا۔ ۱۱ جنوری کو اس نے لاہور پر قبضہ کر کے آگے بڑھنے کا ارادہ کیا۔ محمّد شاہ ان دنوں بیمار تھا اس نے شہزادہ احمد شاہ کو دو لاکھ لشکر کے ساتھ احمد شاہ درّانی کا مقابلہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ نواب قمر الدّین خاں وزیر، اور جے پور کے مہاراجہ جے سنگھ سوائی کا بیٹا ایشر سنگھ اور نواب رعایت خاں وغیرہ امرا بھی اس لشکر میں گئے جو ۲۵ فروری ۱۷۴۸ء کو سرہند پہنچا تھا۔ میرؔ اس سفر میں رعایت خاں کے ساتھ تھے اور خدمات بجا لا رہے تھے۔ اس سفر میں اُنھوں نے انعام اللہ خاں یقین کے دادا محمّد تقی سے ملاقات بھی کی تھی۔ ۲ مارچ کو ابدالی نے سرہند پر قبضہ کر لیا۔ ابھی مغل فوجیں مقابلہ کر رہی تھیں کہ اچانک ایک حادثہ رونما ہوا۔ نواب قمر الدّین خاں وزیر اپنے خیمے میں چاشت کی نماز پڑھ رہے تھے کہ توپ کا ایک گولا اُن کی پیٹھ پر آ کر گرا اور وہ اسی وقت مر گئے۔ لیکن ایک عجیب اتفاق یہ ہوا کہ ایک گولا احمد شاہ ابدالی کے بارود خانے میں بھی جا پڑا اور اس سے اتنا زبردست دھماکا ہوا کہ ہاتھی گھوڑے سب بھاگ گئے اور تقریباً ایک ہزار سپاہی جل کر بھسم ہو گئے مجبوراً ابدالی کو میدان چھوڑنا پڑا اور مغل فوج کو فتح نصیب ہوئی اس کی تاریخ کسی نے "فتح خداساز" (۱۱۶۱ھ) کہی ہے۔ نواب

کی لاش کو لاکر دہلی میں دفن کیا گیا وہ دلی کالج، اجمیری گیٹ (بعد کو ذاکر حسین کالج) کے احاطے میں گرلز کامن روم کے صحن میں مدفون ہیں۔ یہ ان کا خاندانی قبرستان تھا۔

احمد شاہ کی تخت نشینی

جب یہ لاو لشکر دلی کی طرف واپس آرہا تھا تو پانی پت کے قریب یہ خبر ملی کہ محمد شاہ کا انتقال ہوگیا (۱۶ اپریل ۱۷۴۸ء) صفدر جنگ نے فوراً چتر اور تخت شاہی شہزادہ احمد شاہ کے سامنے پیش کیا اور اُسے بادشاہ بنا کر نذریں گذاریں (۲۱ اپریل ۱۷۴۸ء) احمد شاہ نے اُسے وزیر مقرر کر دیا۔ اس طرح جب میر اس قافلے کے ساتھ دلی میں داخل ہوئے تو احمد شاہ بادشاہ ہو چکا تھا۔ اس نے جاوید خاں خواجہ سرا کو نواب بہادر خطاب دے کر امراء کی صف میں شامل کر لیا۔ تخت نشینی کے وقت احمد شاہ کی عمر ۲۲ سال تھی۔ اس کی ماں اودھم بائی مان خاں قوال کی بہن تھی جسے بعد میں نواب قدسیہ صاحب الزماں بیگم کا خطاب عطا ہوا۔ جاوید خاں ہفت ہزاری منصب تک پہنچا۔ مغل دور میں یہ پہلا خواجہ سرا تھا جسے اتنا بڑا اعزاز نصیب ہوا۔ اس زمانے میں طبقۂ شرفا سخت ناراض تھا اور گانے بجانے والوں کی بن آئی تھی۔ ۲۷ اگست ۱۷۵۲ء کو نواب صفدر جنگ نے جاوید خاں کا کام تمام کرا دیا (۲۷ شوال ۱۱۶۵ھ) احمد شاہ کو عماد الملک نے اندھا کر کے تخت سے اتار دیا تھا (سہ شنبہ ۱۰ شعبان ۱۱۶۷ھ / ۲ جون ۱۷۵۴ء) عیسوی حساب سے اس کی عمر ۲۸ سال ۳ ماہ ۱۶ دن

اجمیر کا سفر

صفدر جنگ نے وزیر ہونے کے بعد میر بخشی کا عہدہ سادات خاں ذوالفقار جنگ کو پیش کیا۔

وہ بڑے کرّوفر کے ساتھ رہتا تھا۔ اس نے ریاست جودھپور کے مہاراجہ ابھے سنگھ کے چھوٹے بھائی
بخت سنگھ کو فوجی امداد دے کر ابھے سنگھ سے لڑنے کے لیے بھیج دیا بخت سنگھ نے اپنی فوج کی کمان
رعایت خاں کے سپرد کی اور اس طرح میرؔ بھی اس فوج کے ساتھ سانبھر (راجستھان)، کی طرف
روانہ ہوئے۔ یہاں ابھے سنگھ اور بخت سنگھ کی فوجوں کا مقابلہ ہوا، ابھے سنگھ کی فوج بددل ہو رہی تھی
اُس نے پانسا پلٹتے دیکھا تو ملہار راؤ ہولکر کو درمیان میں ڈال کر صلح کر لی۔ اس جمی ہونے کے بعد میرؔ اجمیر
کی طرف گئے اور حضرت خواجہ معین الدّین چشتی علیہ الرحمہ کے آستانے پر حاضری دی پھر اجمیر کے
قابلِ دید مقامات کی سیر کی۔ وہاں سے پُشکر آئے جو مشہور تیرتھ استھان ہے اور جہاں برہما کا مندر
بھی ہے۔

غالباً پُشکر ہی میں بخت سنگھ اور رعایت خاں کے درمیان کسی بات پر تو تو میں میں ہو گئی۔
نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ دونوں میں باقاعدہ صف آرائی ہو جائے۔ رعایت خاں کے ایک مصاحب
ستار قلی خاں کشمیری نے بخت سنگھ کو گالیاں دی تھیں جس کی وجہ سے وہ بھرا بیٹھا تھا۔ اس موقع پر
میرؔ نے سفارت کے فرائض انجام دیے وہ بخت سنگھ سے جا کر ملے تو رعایت خاں کی طرف سے قسمیں
کھا کر یہ قول و قرار کیے کہ آیندہ ایسا نہیں ہوگا۔ مگر راجا نے رعایت خاں کے رسالے کی بقایا
تنخواہ ادا کر کے انھیں رخصت کر دیا۔ اور میرؔ دلّی واپس آ گئے۔

ملازمت ترک کر دی

اس زمانے میں ایک چاندنی رات کو رعایت خاں اپنی ڈیوڑھی میں مہتابی پر بیٹھا کسی

ڈوم سے گانا سن رہا تھا۔ اس نے میرؔ سے کہا کہ اپنی کسی غزل کے چار پانچ شعر اس لڑکے کو یاد کرا دو تو یہ اپنے طور پر دھن بنا کر گائے گا۔ میرؔ نے اس سے معذرت کرلی تو اس نے اپنے سر کی قسم دے کر ان سے اصرار کیا۔ مجبوراً انھوں نے اُس ڈوم کو اپنے شعر یاد تو کرا دیے مگر یہ بات اتنی ناگوار ہوئی کہ رعایت خاں کی ملازمت چھوڑ دینے کا فیصلہ کرلیا اور پھر اس کے دربار میں نہیں گئے۔

رعایت خاں نے میرؔ کے چھوٹے بھائی محمد رضی کو اپنے پاس سے گھوڑا دے کر ملازمت میں رکھ لیا۔ بہت دنوں بعد میرؔ سے ملاقات ہوئی تو اس نے بہت معذرت کی۔

جاوید خاں کی ملازمت

تھوڑا زمانہ بے روزگاری کا گذرا تھا کہ نواب جاوید خاں خواجہ سرا کی فوج کے بخشی اسدیار خاں نے میرؔ کی سفارش کر کے انھیں جاوید خاں کے ملازموں میں بھرتی کرا دیا۔ گھوڑے اور نوکری کی شرط بھی معاف کرادی۔ مطلب یہ کہ بس تنخواہ لیتے رہو۔ میرؔ کہتے ہیں کہ "وہ میرا بڑا لحاظ اور بہت امداد و اعانت کرتا تھا۔"

فرخ آباد کا سفر

نواب صفدر جنگ کو قائم خاں بنگش (نواب فرخ آباد) سے گہری عداوت تھی اور اس خاندان کو ملیا میٹ کرنے کے منصوبے بہت دنوں سے بنا رہا تھا۔ اس نے پہلے تو حافظ رحمت خاں اور نواب قائم خاں کے درمیان جنگ کا بیج بویا اور جب اس میں قائم خاں بنگش مارا گیا

(نومبر ۱۷۴۹ء) تو قائم خاں کی والدہ کو دھوکے سے بلا کر گرفتار کر لیا اور راجا نول رائے کو وہاں کا حاکم بنا دیا۔ قائم خاں کے بھائی احمد خاں بنگش نے فوج جمع کر کے مقابلہ کیا اور راجا کو قتل کر دیا اور اس کی فوج کو لوٹ کھسوٹ کر مار بھگایا۔ اس خبر کے ملتے ہی صفدر جنگ نے ایک لشکر جرار تیار کیا جس میں سورج مل جاٹ، نجم الدولہ اسحاق خان وغیرہ بھی شامل تھے۔ ۲۳ر جولائی ۱۷۵۰ء کو یہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا لشکر دلّی سے نکلا اور چھوٹی (سہاور) کے مقام پر فرخ آباد سے چند کوس اِدھر میدان کارزار گرم ہوا۔ اس میں نواب اسحاق خاں مارا گیا اور صفدر جنگ زخمی ہوا۔ فوج پسپا ہو کر دلّی آگئی۔ میؔر بھی اس فوج میں نواب اسحاق خاں کے ساتھ گئے تھے اور ان کی موت کے بعد بڑی تکلیفیں جھیلتے ہوئے خوار و خستہ ہو کر دلّی واپس آئے تھے۔ اگلے سال ۱۷۵۱ء میں صفدر جنگ نے دوبارہ لشکر کشی کر کے احمد خاں کو شکست دی۔

مہانراین دیوان کی ملازمت

اِدھر سادات خاں میر بخشی اور جاوید خاں خواجہ سرا میں سخت عداوت تھی۔ اس لیے سادات خاں معزول کر دیے گئے اور ان کی جگہ نظام الملک آصف جاہ (بانی ریاست حیدر آباد) کے بیٹے نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ (جنھوں نے شہر غازی آباد بسایا تھا) امیر الامرا ہوئے۔ اور انھیں دکن کا صوبہ دیا گیا۔ مگر وہ دکن جاتے ہوئے راستے ہی میں ہیضہ سے مر گئے (۱۷۵۱ء)۔ اُن کا منصب اُن کے بیٹے نواب عماد الملک کو ملا۔ اس زمانے میں میؔر کنارہ کش ہو کر بیٹھ گئے تھے اور مطوّل پڑھ رہے تھے۔ مگر ان کا وظیفہ جاری تھا۔ ۲۸ر اگست ۱۷۵۲ء کو صفدر جنگ نے جاوید خاں خواجہ سرا

کرمروا ڈالا تو یہ وظیفہ بند ہوگیا۔ صفدر جنگ کے دیوان مہانرائن نے اپنے داروغہ دیوان خانہ یعنی شرف الدین پیام کے بیٹے میر نجم الدین علی سلاؔم کے ہاتھ کچھ نقد روپیہ بطور امداد بھیجا اور بڑے اشتیاق سے میؔر کو طلب کیا۔ چند ماہ کے لیے میؔر نے مہانرائن دیوان کی ملازمت اختیار کرلی اور یہ زمانہ فراغت کے ساتھ گذرا۔ تقریباً یہی وہ زمانہ ہے جب اُنھوں نے شعراے اردو کا تذکرہ "نکات الشعراء" ترتیب دیا۔

اب صفدر جنگ نے بادشاہ سے بھی بغاوت کردی شاہی لشکر سرکوبی کے لیے میدان میں آگیا۔ چھ مہینے تک بادشاہ اور وزیر کے لشکروں میں جنگ ہوتی رہی اور اس میں پرانا شہر بالکل تاراج ہوگیا۔ آخر وزیر کی فوج کے پانو اکھڑنے لگے تو اس نے صلح کا پیغام بھیجا۔ بادشاہ نے بھی اسے غنیمت جانا اور اُسے اودھ کی گورنری دے کر رخصت کر دیا۔ وزارت کا عہدہ نواب قمرالدین خاں کے بیٹے انتظام الدولہ کے سپرد ہوا۔ (مارچ ۱۷۵۳ء)۔

امیر خاں انجام کی حویلی میں

اس زمانے تک میؔر اپنے سوتیلے ماموں خان آرزو کی حویلی کے پاس ہی رہتے تھے۔ لیکن ۱۷۵۳ء میں وہ نواب امیر خاں انجاؔم (متوفی ۱۸ اپریل ۱۷۴۵ء) کی حویلی میں آگئے۔ اس زمانے میں میؔر کی معاشی حالت اچھی نہیں تھی اور جیسے تیسے گذر ہو رہی تھی۔

سکندر آباد کا سفر

عماد الملک نے مرہٹوں کو اپنے ساتھ ملالیا اور سورج مل جاٹ پر چڑھائی کردی کیونکہ اس

نے صفدر جنگ کی مدد کی تھی اور اب بھی وہ صفدر جنگ سے خط وکتابت کر رہا تھا۔ بادشاہ بھی اس لشکر میں نکلا اور جمنا سے بیس میل کے فاصلے پر سکندر آباد کے میدان میں ڈیرے ڈالے گئے۔ یہاں یہ افواہ پھیلی کہ مرہٹے اور عماد الملک سورج مل سے گٹھ جوڑ کر رہے ہیں اور سب مل کر شاہی لشکر کو لوٹنا چاہتے ہیں۔ بادشاہ ایسا سراسیمہ ہوا کہ حرم کی بعض خواتین اور بیگمات کو بھی گھبراہٹ میں وہیں چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ جو لوگ بچ رہے تھے اُنھیں مرہٹوں نے آکر لوٹ لیا۔ اب قلعہ کا سارا انتظام بھی بدل گیا۔ عماد الملک وزیر ہوا۔ بادشاہ دبک کر قدسیہ باغ میں بیٹھ گیا تھا۔ عماد الملک کے فوجیوں نے اُسے پکڑ کر اندھا کر دیا اور بہادر شاہ اوّل کے پوتے کو عالمگیر ثانی کا لقب دے کر تخت پر بٹھا دیا (۱۷۵۴ء) اس لشکر کے ساتھ میرؔ بھی سکندر آباد تک گئے تھے اور وہاں سے بھاگ کر آنے کے بعد شرم کے مارے کچھ دنوں تک دلّی میں گوشہ نشینی کی زندگی گذارتے رہے۔

خان آرزو لکھنؤ میں

صفدر جنگ نے اودھ میں انتقال کیا تو اس کا بیٹا شجاع الدولہ مسند نشین ہوا۔ نجم الدولہ اسحٰق خاں جو فرخ آباد کی جنگ میں کام آگئے تھے اُن کے بھائی اسحٰق خاں موتمن الدولہ شجاع الدولہ کے دربار میں بڑے بارسوخ تھے۔ سراج الدین علی خان آرزو نے سوچا کہ وہ حقوقِ سابق کا لحاظ کرتے ہوئے میرے لیے کچھ کریں گے اس لیے دلّی سے ہجرت کر کے اودھ پہنچے۔ مگر ابھی وہاں کچھ ہاتھ بھی نہ آیا تھا کہ کسی سفر میں گاڑی الٹنے سے ان کو سخت چوٹیں آئیں اور ۲۷ جنوری ۱۷۵۶ء کو انتقال کر گئے۔ اُن کی لاش دلّی لاکر محلّہ وکیل پورہ میں ان کی حویلی ہی میں دفن کی گئی۔

راجا جگل کشور ثروت

اسی زمانے میں عہد محمد شاہی کے وکیل بنگالہ راجا جگل کشور نے جو بڑی جاہ وحشمت کے ساتھ رہتا تھا، میر کو بلوایا۔ اسے شاعری کا ذوق تھا، ثروت تخلص کرتا تھا۔ میر کے سامنے اپنا کلام اصلاح کے لیے پیش کیا۔ میر کا بیان ہے کہ میں نے اصلاح کی قابلیت نہ دیکھی اور اس کی اکثر تصنیفات کو قلم زد کر دیا۔

راجا ناگر مل کی ملازمت

عہد محمد شاہ کے ایک اور امیر راجا ناگر مل تھے یہ دیوانی خالصہ وتن کے عہدے پر سرفراز تھے اس کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہ کی ذاتی جاگیر اور شخصی معاملات کے نگراں تھے۔ انھیں نائب وزیر کا عہدہ ملا۔ مہاراجا اور عمدۃ الملک کے خطاب بھی عطا ہوئے۔ راجا ناگر مل غریبوں اور مظلوموں سے بہت ہمدردی رکھتے تھے اور ان کی ہر طرح سے مدد بھی کرتے تھے، دوسرے امراء کے ستائے ہوئے لوگوں کو اپنی ڈیوڑھی میں پناہ بھی دے دیتے تھے اس لیے دربار میں ان کے خلاف سازشوں کا جال بچھا ہوا تھا اور یہ بہت چوکنا رہتے تھے۔ راجا جگل کشور نے سفارش کر کے میر کو اُن کے دربار سے وابستہ کرا دیا۔

دلی پر ابدالی کا حملہ

ہندستان پر احمد شاہ ابدالی کے حملے برابر ہو رہے تھے۔ لاہور کا گورنر معین الملک گھوڑے

سے گر کر مر چکا تھا (۱۷۵۳ء)، اور اس کی بیوی مغلانی بیگم صوبہ لاہور پر حکومت کر رہی تھی اس نے مارچ ۱۷۵۶ء میں احمد شاہ ابدالی کو بلا بھیجا وہ دسمبر ۱۷۵۶ء میں لاہور پہنچا اور ۲۸ جنوری ۱۷۵۷ء کو دلّی میں داخل ہو گیا۔ یہاں اس کے سپاہیوں نے ایسی لوٹ مچائی کہ سارے شہر کو کنگال کر دیا۔ بعض امراء سورج مل جاٹ کے قلعوں میں جا کر پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ دلّی والوں کو ایک مہینے تک کھانے پینے کا سامان بھی میسّر نہ آسکا۔ یہاں سے ابدالی کی فوجیں آگرہ اور متھرا کی طرف گئیں وہاں بھی قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ لیکن متھرا میں ابدالی کی فوج میں طاعون اور ہیضہ کی وبا پھیل گئی جس سے سپاہی بددل ہو گئے اور اس نے سورج مل کے قلعوں پر چڑھائی کا ارادہ منسوخ کر کے اپنے وطن کا قصد کر لیا۔ دلّی میں عالمگیر ثانی کو تخت شاہی پر بٹھا دیا اس کی ۱۶ سالہ لڑکی سے اپنے بیٹے تیمور شاہ کی شادی کی۔ جاتے جاتے محمّد شاہ کی دختر حضرت بیگم سے اپنا نکاح پڑھوا لیا۔ (اپریل ۱۷۵۷ء)۔ اس زمانے میں نواب نجیب الدولہ کا عروج ہوا اور وہ میر بخشی بنا دیا گیا۔

اب مرہٹوں نے عمادالملک کو اپنے ساتھ ملا لیا اور نجیب الدولہ پر چڑھائی کر دی۔ لیکن راجا ناگر مل نے شہر کو لوٹ مار سے بچانے کی حد درجہ کوشش کی اور آخر میں روہیلوں سے صلح کر لی نجیب الدولہ سہارنپور کی طرف اپنی جاگیر میں چلا گیا اور احمد خاں بنگش میر بخشی ہو گیا۔

اس زمانے میں عوام تو کیا امراء کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ مغل شہنشاہوں کے خزانے خالی پڑے تھے اور امراء کو دو وقت روٹی بھی مشکل سے مل رہی تھی۔ وہی راجا جگل کشور جس نے میرؔ کو اپنے کلام کی اصلاح کے لیے بلایا تھا اور جو شاہانہ کرّوفر کے ساتھ رہا کرتا تھا اس سے ایک دن میرؔ نے اپنی حالتِ زار بیان کی تو وہ شرم سے پیلا پڑ گیا اور کہنے لگا کیا کروں میں خود مفلس ہوں کچھ بھی ہوتا تو

تھیں دینے سے ہرگز دریغ نہ کرتا۔

میرؔ نے پھر راجا ناگرمل کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ بہت فیاض اور غریبوں کا ہمدرد انسان تھا۔ کہنے لگا کہ کچھ میسر ہوگا تو تمھیں بھی ملتا رہے گا۔ میرؔ اس امید پر اُس کے دربار میں جاتے رہے مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔

ایک دن صبح کی نماز کے بعد راجا ناگرمل کی ڈیوڑھی پر جا پہنچے۔ جے سنگھ نامی چوبداروں کے میردہ نے کہا کہ یہ کون سا دربار کا وقت ہے؟ میرؔ نے کہا کیا کروں اضطرار کے عالم میں آیا ہوں۔ جے سنگھ نے کہا کہ "تم لوگوں کو درویش کہتے ہیں تم شاید نہیں جانتے کہ اللہ کے حکم کے بغیر ایک ذرّہ بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ یہاں اپنی ریاست کے آگے تمھاری کسے فکر ہے۔ صابر و شاکر رہنا چاہیے۔ ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔ یہاں تو تمھاری رسائی مشکل ہے البتہ ان کے بڑے لڑکے مل سکتے ہیں۔"

میرؔ بہت شرمندہ ہوئے اور اپنا سا منھ لے کر واپس آئے۔ جب افلاس نے بہت تنگ کیا تو ایک رات کو راجا کے لڑکے سے ملنے بھی پہنچ گئے۔ دربان نے وہاں بھی روک دیا اور ملنے نہیں دیا۔ کچھ دیر کے بعد پھر گئے اُس وقت اتفاق سے دربان غیر حاضر تھا۔ یہ اندر پہنچ گئے۔ راجا کے بیٹے سے ملے۔ کچھ شعر بھی سنائے۔ میرؔ کے ایک واقف کار خواجہ غالب وہاں موجود تھے انھوں نے تفصیل سے میرؔ کا حال گوش گذار کیا تو راجا نے کچھ وظیفہ مقرر کر دیا جو ایک سال تک جاری رہا۔ یہ روز رات کو نماز عشا کے بعد ڈیوڑھی پر جاتے تھے پائین باغ میں نشست ہوتی تھی اور شعر سنائے جاتے تھے۔ اس طرح راجا ناگرمل کے بیٹے کی بدولت میرؔ کا زمانہ کسی قدر تنگی کے ساتھ گذر گیا۔

میرؔ کا مکان لُٹ گیا

اب دلّی پر مرہٹوں کی یورش شروع ہوئی۔ دربار میں سازشوں کا جال بچھا ہوا تھا پہلے ۲۹ نومبر ۱۷۵۹ء کو عالمگیرِ ثانی کو ایک فقیر کی زیارت کے بہانے سے کوٹلہ فیروز شاہ میں لاکر قتل کر دیا اور اس کی لاش جمنا کی ریتی میں پھینک دی پھر اگلے دن نواب قمرالدّین خاں کے دوسرے بیٹے انتظام الدولہ کو بھی نماز پڑھتے میں گلے میں پھندا ڈال کر ہلاک کر دیا دوسرے دن اورنگ زیب کا پوتا اور کام بخش کا بیٹا شاہ جہاں ثانی کے لقب سے تخت پر بٹھا دیا گیا۔ اس کے زمانے میں پھر احمد شاہ ابدالی کی فوجیں دلّی تک آگئیں اور ۸ --- ۱۰ دن تک لوٹ مار کا بازار گرم رکھا۔ ہزاروں قتل ہو گئے اور بے شمار خاندان شہر چھوڑ کر جنگلوں میں جا چھپے۔ پرانا شہر خاک میں مل گیا۔ میرؔ کا بھی ایک چھوٹا سا مکان سڑک کے کنارے واقع تھا وہ ڈھا دیا گیا اور جو کچھ سامان تھا لٹ گیا۔

مرہٹے جو ابدالی فوج سے شکست کھا کر بھاگے تھے پھر تازہ دم ہو کر اور نئی کمک لے کر آپہنچے۔ ابدالیوں نے شاہ جہاں ثانی کو معزول کر کے سلاطین میں بھیج دیا اور عالی گہر کے بیٹے جواں بخت کو ولی عہد بنا دیا۔ سکندر آباد کے قریب مرہٹوں کا اور ابدالی کا مقابلہ ہوا مرہٹہ فوج بھاگ کر سورج مل کے قلعوں میں پناہ گزین ہو گئی۔ اس وقت سورج مل نے بھی ان کی مدد کرنے میں کوئی فائدہ نہ دیکھا اور طرح دے گیا۔ مجبوراً مرہٹے صلح کر کے اپنے علاقوں میں چلے گئے وہاں انھوں نے ابدالی فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے زبردست تیاریاں کیں اور ایک بھاری لاؤ لشکر کے ساتھ شمال کا رُخ کیا۔ نجیب الدولہ نے شجاع الدولہ، احمد خاں بنگش، حافظ رحمت خاں وغیرہ کو اپنے ساتھ ملا لیا اور سب کو مفتوحہ ملک میں سے حصّہ دینے کا وعدہ کیا۔ مرہٹہ فوج کی کمان سداشیو بھاؤ کر رہا تھا۔ ۱۳ جنوری

۱۷۶۱ء کو ہندستان کی وہ عظیم جنگ ہوئی جسے "تیسری جنگ پانی پت" کہا جاتا ہے اور جو مہابھارت یدھ کے بعد ہندستان میں سب سے بڑی اور فیصلہ کن جنگ تھی۔

دلّی سے ہجرت

اب دلّی کے حالات ایسے غیر یقینی ہوگئے تھے کہ یہاں رہنا موت کو دعوت دینا تھا میرؔ نے راجا ناگرمل سے گذارش کی کہ میں کہیں ہجرت کر جانا چاہتا ہوں۔ راجا نے کچھ دے کر انھیں رخصت کر دیا۔ یہ بیوی بچّوں کو ساتھ لے کر پیدل ہی روانہ ہوگئے۔ دن بھر میں بمشکل ۸ — ۹ کوس منزل طے کر سکے۔ رات ہوئی تو ایک سرائے میں درخت کے نیچے پڑ رہے۔ اگلی صبح کو اُدھر سے راجا جگل کشور کی بیوی گذریں۔ اُنھوں نے میرؔ اور ان کے خاندان کی یہ تباہ حالت دیکھی تو اپنے ساتھ برسانہ لے گئیں جو ہندوؤں کا تیرتھ استھان ہے۔

برسانہ میں

برسانہ سے رانی جگل کشور نے کاماں (راجستھان) کا رُخ کیا جو وہاں سے تیس کوس پر ہے یہ ریاست جے پور کی سرحد تھی، میرؔ نے یہاں عشرۂ محرّم گذارا اور ۱۱ محرم کو یہاں سے روانہ ہوکر کمھیر (راجستھان) کی طرف پہنچے۔ کمھیر میں نواب صفدر جنگ کے خزانچی لالہ زادھا کشن کا بیٹا بہادر سنگھ مل گیا وہ میرؔ کو اپنے ساتھ لے گیا اور ضروریات کی فراہمی میں میرؔ کی مدد کی۔ اُس کی بدولت کمھیر میں یہ زمانہ کسی قدر اطمینان سے گذر گیا۔ اس وقت اُن کے بیٹے فیض علی بھی ساتھ تھے ظاہر ہے بیوی بھی ہوں گی۔

نواب اعظم خاں

دہلی کے بہت سے امراء اور شرفاء کے خاندان دہلی سے نکل کر آس پاس کے محفوظ علاقوں میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ سورج مل جاٹ کے طویلے میں ہاتھی گھوڑوں کی جگہ یہ پناہ گزین ہی ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان میں نواب اعظم خاں بھی تھے (جن کے نام سے دلّی میں آج بھی محلّہ حویلی اعظم خاں موجود ہے) یہ عہد محمّد شاہ میں شش ہزاری منصب دار تھے۔ ان کے بیٹے کا خطاب بھی اعظم خاں تھا اور وہی سورج مل کے قلعے میں پڑا ہوا تھا ایک دن میؔر اس سے ملنے گئے اور پرانے وقتوں کو یاد کر کے رونے لگے۔ دیکھا تو خان بہت فکرمند ہے۔ میؔر نے پریشانی کا سبب پوچھا۔ اس نے کہا کہ تم دلّی میں ملنے آیا کرتے تھے تو طرح طرح کی مٹھائیاں اور حلوے ہم دونوں مل کر کھاتے تھے۔ آج کچّی کھانڈ بھی میسّر نہیں ہے کہ دو پیالہ شربت ہی بن جائے۔ میؔر نے کہا کہ میں کھانے پینے کا حریص نہیں ہوں وہ حلوہ اور شیرینی کا زمانہ تھا یہ تلخیاں جھیلنے کا موسم ہے۔ زمانہ تو بدلتا ہی رہتا ہے۔ اتنے میں ایک عورت سر پر خوان رکھے ہوئے دروازے سے داخل ہوئی اور بولی کہ سعدالدّین خاں خانساماں کی بہن نے آپ کو دعا کہی ہے۔ کچھ حلوائے نزاکت اور شبنم کی شیرینی بھیجی ہے۔ خاں نے سرپوش اٹھایا اور حلوے پر اس کی نظر پڑی تو باغ باغ ہو گیا۔ کہنے لگا "یہ روسیاہ تو اپنی قدر خوب جانتا ہے۔ ایک زمانے سے فاقہ کشی کر رہا ہوں۔ حلوے اور شیرینی کا تو ذکر ہی کیا! کہیں سے روٹی کا ایک ٹکڑا بھی نہیں آیا۔ تم میرے عزیز مہمان ہو۔ یہ سب تمھارا ہے۔ میرا حصّہ مجھے دے کر باقی اپنے گھر بھیج دو۔" میؔر نے کہا: یہ تو بہت ہے۔ میں اتنے سارے کا کیا کروں گا کہنے لگا کہ تمھارے بیٹے میر فیض علی کے

کام آئے گا۔ غرض اس نے اصرار کر کے وہ خوان میر کے گھر بھجوا دیا اور انھوں نے کئی دن تک اسی حلوے پر گذارا کیا۔

راجا بشن سنگھ

پھر راجا ناگرمل کے چھوٹے بیٹے راجا بشن سنگھ نے میر کو بلوایا اور حالات دریافت کیے۔ کہنے لگا کہ راجا صاحب کے آنے تک تم میرے ساتھ ہی رہو۔ میر نے کہا کہ میرے پاس کھانے پینے کے لیے کچھ نہیں ہے تو اس نے ضرورت کا سارا سامان مہیا کر دیا۔

۱۷۶۱ء میں راجا ناگرمل دوبارہ کُمھیر میں پہنچے جو سورج مل کا قلعہ تھا۔ میر اس زمانے میں وہیں ٹھہرے ہوئے تھے۔ راجا کی خدمت میں باریاب ہوئے اور عرض کیا کہ میں آپ کی تشریف آوری کے انتظار میں ٹھہرا ہوا تھا اب مجھے اجازت دیجیے کہ کسی طرف نکل جاؤں کیونکہ حالات بہت بگڑ چکے ہیں اور ان کا مقابلہ کرنے کی سکت باقی نہیں رہی ہے۔ راجا نے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے "بیاباں مرگ" ہونے کا ارادہ رکھتے ہو۔ مگر میں تمھیں چھوڑوں تب نا۔ اسی دن راجا نے خرچ کے لیے کچھ بھیجا اور پچھلا وظیفہ بھی جاری کر دیا۔

راجا ناگرمل وہیں کمھیر میں رہ پڑے تھے اور ان کے ساتھ دوسرے سیکڑوں خاندان پل رہے تھے۔ یہ سورج مل جاٹ کا علاقہ تھا جو ایک طاقت ور اور مدبر فرماں رواں تھا اس لیے اس کی ریاست میں قدرے امن و امان میسّر تھا۔ دلّی میں مرہٹوں کی فوج جنگ کر رہی تھی اور ابدالی فوج انھیں شکست دینے کے لیے جی جان کی بازی لگائے ہوئے تھی۔ لیکن پانی پت کی جنگ نے

مرہٹوں کا شیرازہ بکھیر دیا اور شمالی ہند سے اُن کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔

میرؔ کی دلّی میں آمد

جنگ پانی پت کے بعد میرؔ دلّی آئے تو یہ دنیا ہی دوسری تھی۔ وہ لکھتے ہیں :

"میں ایک دن ٹہلتا ہوا شہر کے تازہ ویرانوں سے گذرا۔ ہر قدم پر روتا اور عبرت حاصل کرتا تھا۔ جوں جوں آگے بڑھا، حیرت بڑھتی گئی۔ مکانوں کو شناخت نہ کر سکا، آبادی کا پتا تھا نہ عمارتوں کے آثار۔ نہ اُن کے مکینوں کی خبر۔ گھر کے گھر مسمار تھے اور دیواریں شکستہ۔ خانقاہیں صوفیوں سے خالی۔ خرابات رندوں سے۔ یہاں سے وہاں تک ایک ویرانہ تھا لق و دق۔

نہ وہ بازار تھے جن کا بیان کروں، نہ بازار کے وہ حسین لڑکے۔ حسن کہاں جسے تلاش کروں ؟ یارانِ عاشق مزاج کدھر گئے ؟ جوانانِ حسین گذر گئے۔ پیرانِ پارسا چلے گئے۔ محل خراب ہو گئے، گلیاں معدوم۔ وحشت برس رہی تھی اُنس ناپید تھا۔

ناگاہ اس محلّے میں آنکلا جہاں میں رہتا تھا، جلسے کرتا تھا، شعر پڑھتا تھا، عاشقانہ زندگی گذارتا تھا، راتوں کو روتا، خوش قدوں سے عشق لڑاتا، ان کے حسن کی تعریف کرتا اور لمبی لمبی زلفوں والے معشوقوں کے ساتھ رہتا تھا۔ حسینوں کی پرستش کرتا اور ایک لمحے کی اُن کی جدائی ہوتی تو بے قرار ہو جاتا تھا۔ محفل سجاتا تھا

حسینوں کو بلاتا تھا اُن کی مہانداری کرتا تھا۔اب کوئی ایسا مانوس چہرہ نظر نہ آیا
جس سے دو باتیں کرلیتا کوئی معقول انسان نہ پایا جس کے پاس جا بیٹھتا۔اس
وحشت انگیز گلی سے نکل کر ویران راستے پر آ کھڑا ہوا اور حیرت سے تباہی کے
چھوڑے ہوئے نشانات دیکھتا رہا۔بہت صدمہ اٹھایا اور یہ عہد کیا کہ اب اِدھر
نہ آؤں گا۔" (میر کی آپ بیتی ۱۳۹)

جنگ پانی پت کے بعد ابدالی کا ہر فوجی مالدار ہو گیا تھا اور اپنے بیوی بچّوں کو یاد کر رہا تھا۔فوج نے غوغا کیا کہ ہم اب یہاں نہیں رہیں گے مجبوراً ابدالی نے قندھار کا عزم کیا۔شہر کا انتظام نجیب الدولہ کے سپرد کیا۔یہاں سے کوچ کر کے سرہند کی طرف گئے اور وہاں زین خاں کو صوبیدار بنایا پھر لاہور کا رُخ کیا۔لیکن یہاں سکھوں کے ہاتھوں ابدالی فوج کو زک اٹھانی پڑی۔بڑی مشکل سے جان بچا کر وہاں سے بھاگے اور ہزاروں تہ تیغ ہو گئے۔سکھوں نے لاہور کے صوبہ پر دریائے اٹک تک قبضہ کر لیا۔

اِدھر سورج مل نے مرکز کی کمزوری کا فائدہ اٹھایا، آگرہ اور اس کے اطراف پر قابض ہو گیا۔ (۱۷۶۲ء) فاضل خاں نامی قلعہ دار نے نمک حرامی کر کے آگرے کا قلعہ بھی اس کے حوالے کر دیا۔شاہ عالم نے بھاری لشکر لے کر اس کی سرکوبی کا ارادہ کیا۔سورج مل اپنے قلعوں میں جا کر بیٹھ گیا اور راجا ناگر مل کو بھی طلب کر لیا۔میر بھی ساتھ گئے۔راجا نے تدبیر سے کام لیا اور جنگ کو ٹال دیا۔اپنا سفیر بھیج کر شاہی فوج سے صلح کر لی۔

میر کا سفر آگرہ

اس سفارت میں میر بھی آگرہ پہنچے۔تینتیس سال کے بعد اُنھوں نے اپنے وطن کو دوبارہ دیکھا

جسے ۱۴-۱۵ سال کی عمر میں چھوڑا تھا۔ پہلے اپنے والد اور منہ بولے چچا (سید امان اللہ) کے مزاروں پر گئے پھر شہر کے دوسرے لوگوں سے ملاقات کی شاعر کی حیثیت سے ان کی شہرت وہاں پہلے ہی پہنچی ہوئی تھی۔ اکثر شعراء نے امام فن سمجھ کر میرؔ سے ملاقات کی۔

شام کو میرؔ دریائے جمنا کی طرف سیر کرنے نکل جاتے تھے۔ مقامی لوگ انھیں گھیرے رہتے تھے۔ آگرے کے اس سفر کا حال میرؔ یوں لکھتے ہیں:

"میری معنی آفرینی کا شہرہ تو عالمگیر تھا۔ الغرض حسین، سیاہ پلکوں والے، اچھی سج دھج والے، جامہ زیب اور پاکیزہ طینت شاعر مجھے نہیں چھوڑتے تھے اور بڑی عزّت کرتے تھے۔ دو تین بار سارے شہر میں گھوما وہاں کے عالموں، فقیروں اور شاعروں سے ملا۔ لیکن کوئی ایسا مخاطب نہ ملا جس سے بات کرکے دلِ بیتاب کو تسلّی ہو۔ میں نے سوچا خدا کی شان۔ یہ وہی شہر ہے جس کی ہر گلی میں عارفِ کامل، فاضل، منشی، شاعر، دانش مند، فقیہ، متکلم، حکیم، صوفی، محدّث، مدرس، درویش، متوکل، شیخ، ملّا، حافظ، قاری، امام، موذن، مدرسہ، مسجد، خانقاہ، تکیہ، مہمان سرا، مکان اور باغ تھے۔ آج مجھے ایسی کوئی جگہ نظر نہیں آتی جہاں بیٹھ کر خوش ہو جاؤں۔ ایسا آدمی نہیں ملتا جس سے گفتگو کرسکوں۔ شہر کو ایک وحشت ناک ویرانہ پایا اور نہایت صدمہ اٹھا کر لوٹ آیا۔ اس طرح چار مہینے وطنِ مالوف میں گذارے۔ رخصت ہوتے وقت آنکھیں بھر آئیں۔"

(میرؔ کی آپ بیتی ۱۴۳)

آگرے میں چار ماہ گذار کر میرؔ پھر سورج مل کے قلعوں (کاماں، کمھیر) میں واپس آ گئے۔ یہ ۱۷۶۳ء تھا۔ اسی زمانے میں سورج مل کے بیٹے جواہر سنگھ نے فرخ نگر کے نواب سے جنگ چھیڑ دی۔ دو مہینے تک جھڑپیں ہوتی رہیں تو سورج مل بھی اپنی فوج لے کر بیٹے کی مدد کے لیے نکلا اور راجا ناگر مل سے رخصت ہونے آیا۔ راجا بڑی سوجھ بوجھ کا آدمی تھا اس نے سمجھایا کہ خود جنگ کرنے جاؤ گے تو فریق ثانی کی حمایت پر نجیب الدولہ آ جائے گا۔ مگر سورج مل نے یہ مشورہ ایک کان سن کر دوسرے کان سے اڑا دیا۔ فرخ نگر پہنچ کر وہاں کے رئیس کو قید کر لیا اور اس کے زن و فرزند کو اسیر بنا لیا۔ انھوں نے نجیب الدولہ سے فریاد کی۔ نجیب الدولہ نے سورج مل کو سمجھایا کہ اب ان کو معاف کر دے اور اپنے قلعوں میں واپس ہو جائے، مگر وہ گھمنڈ میں آ کر ڈٹا رہا۔ نجیب الدولہ نے ہر چند کہا کہ میرا آپ سے جنگ کرنے کا ارادہ نہیں ہے اس لیے میں نے اپنی فوج کو باہر نہیں نکالا ہے خواہ مخواہ غریب لوگ ہلاک ہوں گے اور تکلیف اٹھائیں گے۔ سورج مل نے کہلا بھیجا کہ میں تو نواب کی فوج کے دم خم دیکھ کر جاؤں گا۔ مجبوراً نجیب الدولہ کو میدان میں اترنا پڑا۔ گھمسان کا رن پڑا اور ۲۵ر دسمبر ۱۷۶۳ء کو سورج مل لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس کی فوج سب تتر بتر ہو گئی اب نجیب الدولہ کی فوج نے ان بھگوڑوں کا پیچھا کیا اور ان کا علاقہ فتح کرنے کے لیے آگے بڑھی اس موقع پر بھی راجا ناگر مل کی دور اندیشی نے کام کیا اس نے نواب کو لکھا کہ آپ نے ایسی شاندار فتح مفت میں حاصل کر لی ہے، اب مناسب ہوگا کہ اسے غنیمت سمجھیں اور پیچھے کو لوٹ جائیں ورنہ یہاں بھاری فوج موجود ہے اگر اُس نے ہمت سے مقابلہ کیا تو پانسا پلٹ جائے گا۔ نجیب الدولہ نے یہ مشورہ مان لیا اور دہلی کو واپسی کا حکم دے دیا۔ اب جاٹوں کا سردار جواہر سنگھ ہو گیا جو باپ کے زمانے سے ہی ریاست پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔

نواب شجاع الدولہ اپنے مشیروں کے بہکائے میں آکر شاہ عالم کو ساتھ لے کر انگریزوں پر چڑھ دوڑا تھا اور یہ سوچا تھا کہ تھوڑی سی تگ و دَو کے بعد عظیم آباد (پٹنہ) کا علاقہ ہاتھ آجائے گا تو اسے بھی اودھ کی ریاست میں ملا لوں گا لیکن بکسر کے میدان میں شکست کھا کر واپس ہوا اور اس جنگ کے نتیجے میں شاہ عالم انگریزوں کے وظیفہ خوار بن گئے۔ ان کا دو لاکھ روپیہ ماہانہ مقرر ہو گیا اور ملک کا انتظام کمپنی بہادر کے ہاتھوں میں آگیا۔

نواب عماد الملک

جواہر سنگھ اپنے باپ کے خون کا بدلہ لینے کی فکر میں تھا۔ اس نے عماد الملک کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ عماد الملک نے اپنے اہل و عیال کو فرخ آباد بھیج دیا تھا اور خود جاٹوں کے علاقے میں پڑا ہوا تھا اسی زمانے میں اس سے میرؔ کی ملاقات ہوئی۔ اس نے میرؔ کے ساتھ سلوک بھی کیا جب بھی میرؔ جاتے تھے کچھ نہ کچھ لے کر آتے تھے۔

آگرہ کا دوسرا سفر

شجاع الدولہ نے اُدھر تو انگریزوں سے صلح کر لی، اِدھر بادشاہ سے بھی تو بہ تلا کر کے وزارت کا خلعت پہن لیا (۱۳ ربیع الاوّل ۱۱۷۹ھ / ۳۰ اگست ۱۷۶۵ء) اس عرصہ میں جاٹوں نے سکھوں سے ساز باز کر کے مرہٹوں پر ہلّہ بول رکھا تھا لیکن ابدالی کے آنے کا غلغلہ بلند ہوا تو مرہٹے بھاگ گئے اور جواہر سنگھ آگرہ میں آکر بیٹھ گیا۔ راجا ناگر مل ڈیگ سے چل کر جواہر سنگھ سے ملنے گئے تو میرؔ بھی ان

کے ہم رکاب تھے۔اس طرح میرؔ نے ایک بار پھر اپنے ماں باپ اور چچا کے مزارات پر حاضری دے لی۔ اس بار آگرے میں ان کا قیام پندرہ دن تک رہا۔یہاں سے کمھیر کو واپس آ گئے۔

میرؔ کاماں میں

۸/اپریل ۱۷۶۹ء کو جواہر سنگھ قتل کر دیا گیا اور اس کا بھائی راؤ رتن سنگھ جانشین ہوا۔یہ ظالم شرابی اور حریص حکمران تھا۔اسے کیمیا بنانے کا شوق تھا گو سائیں روپانند نے پہلے کیمیا کے نام پر اس سے بہت دولت اینٹھی اور جب پردہ فاش ہونے کا وقت آیا تو ایک دن رتن سنگھ کو ہلاک کر دیا۔اس کا شیر خوار نابالغ بیٹا کیسری سنگھ جانشین ہوا۔نول سنگھ کا سالا دان سنگھ ریجنٹ مقرر ہو کر حکومت کرتا رہا۔ سورج مل کے بیٹوں میں بھی اقتدار کے لیے رسّا کشی شروع ہو چکی تھی۔ادھر سورج مل اور جواہر سنگھ کے قتل ہونے کے بعد جاٹوں کے علاقے میں دہلی والوں کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں ہوتا تھا۔یہ تقریباً بیس ہزار خاندان تھے جو راجا ناگرمل کی حمایت میں پڑے ہوئے تھے۔راجا نے شورش کا ماحول دیکھا تو ان سب کو وہاں سے نکال کر لے جانے کا ارادہ کیا مگر جاٹ ٹال مٹول کرتے رہے یعنی ان خاندانوں کو یرغمال بنا کر رکھنا چاہتے تھے۔مگر راجا نے ہمّت سے کام لیا اور اپنے دونوں بیٹوں کو ساتھ لے کر خود قلعہ سے باہر نکلا اور ایک شخص کو بھی وہاں خطرے میں نہیں چھوڑا۔دو تین دن مسلسل سفر کر کے کاماں میں آگیا میرؔ بھی اس کے ساتھ ہی تھے۔

فرخ آباد کا سفر

جب شاہ عالم کا لشکر فرخ آباد کی طرف گیا ہوا تھا تو راجا ناگرمل نے میرؔ کو سفیر بنا کر نواب

حسام الدین خاں کے پاس بھیجا۔ میر کاماں سے فرخ آباد آئے اور حسام الدین خاں سے عہد و پیمان درست کرلیے۔ لیکن راجا کے چھوٹے بیٹے کو یہ پسند نہیں تھا کیونکہ میر اس کے بڑے بھائیوں سے زیادہ تعلقات رکھتے تھے۔ اُس نے باپ کو بہکا دیا کہ ہمیں مرہٹوں سے مدد لینی چاہیے حسام الدین خاں سے نہیں۔ چنانچہ راجا کا لشکر بجائے لشکر شاہی میں فرخ آباد کی طرف جانے کے، دلّی کی سمت روانہ ہوگیا میر بھی اس قافلے کے ساتھ دلّی آگئے۔ انھوں نے اپنے بیوی بچوں کو عرب کی سرائے میں چھوڑا اور راجا ناگر مل کے قافلے سے علیحدگی اختیار کرلی۔ کیونکہ ان کے کیے ہوئے عہد و پیمان کو بے سبب توڑ دیا گیا تھا۔

سکرتال کا سفر

مرہٹہ سردار سیندھیا فرخ آباد سے شاہی لشکر کو ساتھ لے کر شہر دہلی میں داخل ہوا (۶ر جنوری ۱۷۷۲ء) یہاں آکر یہ پروگرام بنایا کہ بادشاہ کو ضابطہ خاں پر چڑھا کر لے جائیں۔ دہلی میں آنے کے گیارہ دن کے بعد شاہ عالم اپنا لشکر لے کر نکلا۔ لونی، باغپت، غوث گڑھ، چاند پور (رڑکی سے ۱۵ میل مشرق میں) ہوتا ہوا سکرتال پہنچ گیا۔ یہاں ضابطہ خاں نے مورچہ بنا رکھا تھا۔ میر اس سفر میں شاہی لشکر کے ساتھ رائے بہادر سنگھ کی جمعیت میں شامل تھے۔

۲۳ر فروری ۱۷۷۲ء کو سکرتال کے میدان میں معمولی سی جھڑپ ہوئی۔ ضابطہ خاں بھاگ گیا اور اس کے زن و فرزند اسیر کرلیے گئے۔ مال غنیمت کی تقسیم پر شاہی فوج ناراض ہوگئی۔ شاہی قافلہ جس میں میر بھی شامل تھے نجیب آباد، نہٹور، شیر کوٹ، سیوہارہ، سلیم پور، امروہہ کے راستے سے واپس ہوا۔

گنگا پار کر کے بکسر، ہاپوڑ، لاکھن ہوتے ہوئے ۹ر جولائی ۱۷۷۲ء کو دلّی پہنچے۔

اس زمانے میں میرؔ شاہی لشکر کے ہر سردار سے ملتے تھے، یہ لوگ ایک مشہور شاعر سمجھ کر کچھ مدد کر دیتے تھے۔ اس سے میرؔ کے لفظوں میں "کتّے بلّی کی سی زندگی" گذر رہی تھی۔ نواب حسام الدین خاں کے چھوٹے بھائی وجیہہ الدّین خاں نے کچھ وظیفہ مقرّر کر دیا تھا۔

مئی ۱۷۷۳ء میں راجا ناگر مل کی جگہ دیوانی خالصہ وتن کا عہدہ نواب مجد الدولہ عبد الاحد خاں کو ملا، نواب حسام الدّین خاں قید کر لیے گئے۔ نجف خاں نے دلّی کے جنوب میں کچھ علاقہ جاٹوں کے قبضے سے نکال لیا تھا اور خاصی بے ترتیب فوج جمع کر لی تھی۔ بظاہر دہلی کی حالت بھی کچھ سُدھری تھی مگر یہ ایسا تھا جیسے بجُھنے سے پہلے شمع بھڑکتی ہے۔ فروری ۱۷۷۴ء میں اس نے آگرہ کا قلعہ بھی جاٹوں سے چھین لیا۔ اس زمانے میں میرؔ خانہ نشین رہے۔ ابوالبرکات خاں صوبہ دار کشمیر کے بیٹے اعظم الدولہ ابوالقاسم خاں سے کچھ وظیفہ ملتا تھا اور کبھی کبھی بادشاہ بھی کچھ بھیج دیتے تھے۔ دلّی سیاسی طور پر تو برباد ہو ہی چکی تھی اب یہاں ادبی اور علمی مجلسوں میں بھی سنّاٹا تھا۔ مرزا رفیع سوداؔ، میر سوزؔ، قائم چاندپوری اور مصحفیؔ ترکِ وطن کر چکے تھے۔ حاتمؔ، مرزا مظہرؔ اور خواجہ میر دردؔ زندہ تھے مگر گوشوں میں اپنی عزت بچائے بیٹھے تھے۔ اب مشاعروں میں جو شاعر نظر آتے تھے وہ میرؔ کے ہم سر نہ تھے اُن سے جونیر تھے، اس لیے میرؔ کا اُن سے برتاؤ بھی اسی انداز کا ہوتا تھا۔ تقریباً اسی دور میں بقا اللہ خاں بقاؔ (شاگرد حاتمؔ)، اور محمد امان نثارؔ سے اُن کا ہجو گوئی کا معرکہ ہوا۔

میرؔ کا سفرِ لکھنؤ

اودھ میں شجاع الدولہ کا انتقال ہو گیا (ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ / جنوری ۱۷۷۵ء) اور نواب

آصف الدولہ مسند نشین ہوتے۔ ایک دن انھوں نے نواب سالار جنگ پسر نواب اسحاق خاں موتمن الدولہ کے سامنے تذکرہ کیا کہ میر لکھنؤ کیوں نہیں آتے؟ انھوں نے عرض کیا کہ اگر کچھ زادِ راہ مرحمت ہو جائے تو ضرور آجائیں گے۔ نواب نے زادِ راہ کے لیے حکم دے دیا۔ اب نواب سالار جنگ نے میر کو خط لکھا کہ نواب صاحب طلب فرماتے ہیں جس طرح بن پڑے یہاں آجاؤ۔ میر تو پہلے ہی دل برداشتہ بیٹھے تھے فوراً سفر کی تیاری کی اور روانہ ہو گئے۔ اس سفر میں میر ضیاء الدین ضیاؔ دہلوی ان کے ساتھ تھے جن کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ میر نے اِن سے سارے راستے بات نہیں کی کہ میری زبان خراب ہو گی۔ یہ میر ضیا میر حسن کے استاد ہیں۔ چند روز میں فرخ آباد سے گذر ہوا۔ نواب مظفر جنگ نے بہت اصرار کیا کہ وہیں قیام کریں لیکن میر نے قبول نہ کیا۔ لکھنؤ پہنچ کر پہلے نواب سالار جنگ سے ملے انھوں نے نواب صاحب سے تذکرہ کر کے ضروریات کا سب سامان مہیا کرا دیا۔ چار پانچ دن کے بعد اتفاقاً نواب صاحب مرغوں کی لڑائی کا تماشا دیکھنے آئے وہاں میر بھی موجود تھے۔ قیافے سے پہچان لیا اور پوچھا: "تم میر محمد تقی ہو"؟ یہ آداب بجا لائے۔ نواب صاحب نے گلے سے لگایا اور اپنی نشست گاہ پر لے گئے۔ پھر اپنا کلام بھی سنایا۔ میر سے بھی ان کے اشعار سنے نواب سالار جنگ نے کہا کہ میر حسب الطلب آئے ہیں اب بندگان عالی مختار ہیں انھیں کوئی جگہ مرحمت فرمائیں اور جب مرضی مبارک ہو خدمت میں بلوا بھیجیں۔" نواب نے فرمایا کہ میں تنخواہ مقرر کر کے تمھیں اطلاع دوں گا۔ دو تین دن کے بعد یاد فرمایا۔ میر دربار میں گئے اور نیا لکھا ہوا قصیدہ لیتے گئے۔ نواب نے سنا اور اپنے مصاحبوں کے صف میں انھیں داخل کر لیا۔

لکھنؤ میں وارن ہسٹنگز کی آمد

میر کے وہاں پہنچنے کے ایک ڈیڑھ سال بعد ہی (۱۱۹۸ھ / ۱۷۸۳ء) لکھنؤ میں وارن ہسٹنگز گورنر جنرل کلکتہ سے آیا اور آصف الدولہ کی طرف سے اس کا نہایت شاندار استقبال کیا گیا۔ آخر محرم ۱۱۹۸ھ (دسمبر ۱۷۸۳ء) نواب آصف الدولہ شکار کھیلنے کے لیے بہرائچ کی طرف گئے تو میر ان کے ساتھ تھے اور ایک نظم شکار نامہ موزوں کی۔ دوبارہ شکار کے لیے بیلی بھیت کے پہاڑوں میں آئے یہاں بھی میر ہم رکاب تھے اور دوسرا شکار نامہ لکھا۔ ربیع الاوّل ۱۱۹۸ھ / جنوری ۱۷۸۴ء میں لکھنؤ کو واپسی ہوئی۔ اسی شکار نامہ کے آخر میں یہ دو شعر بھی ہیں۔

جواہر تو کیا کیا دکھایا گیا　　　خریدار لیکن نہ پایا گیا
متاعِ ہنر پھیر کر لے چلو　　　بہت لکھنؤ میں رہے گھر چلو

آصف الدولہ میر کی خاطر داری میں کمی نہ کرتے تھے مگر ان کے مزاج میں غرورِ کمال اور استغنا تھا۔ اس کا اظہار عوام سے تو ہوتا ہی تھا امراء کے سامنے بھی نہ چوکتے تھے۔ یکتا نے لکھا ہے کہ ایک بار میر تازہ قصیدہ لکھ کر دربار میں لائے۔ نواب نے سننا شروع کیا، میر اطمینان سے پڑھ رہے تھے اور قصیدہ طولانی تھا۔ اتفاق سے ملّا محمد مغل نامی ایک ایرانی بھی اُس دن ولایت سے تازہ وارد تھا اور وہ بھی نواب کی مدح میں کچھ اشعار سنانا چاہتا تھا مگر میر کے قصیدے نے ہی بہت وقت لے لیا۔ جب یہ پڑھ چکے تو ملّا محمد نے کہا: "میر صاحب قصیدہ تو خوب ہے مگر بہت طولانی ہے۔ اگر نواب صاحب کا دماغ وفا نہ کرتا تو اِسے کون سن سکتا تھا؟" میر نے اپنے ہاتھ سے بیاض پٹک دی اور کہا کہ اگر نواب

صاحب کا دماغ وفا نہ کرتا تو میرا کب کرتا ؟

نواب سعادت علی خاں

نواب آصف الدولہ کے بعد سعادت علی خاں مسند نشین ہوئے ۔ اُنھوں نے بھی میر کی سرپرستی جاری رکھی ۔ ان کے زمانے میں میرکو دوسو روپیہ ماہانہ ملتا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ کے لیے یہ تنخواہ رک گئی تھی اور میر نے دربار میں جانا بند کر دیا تھا ۔

میر لکھنؤ کے مشاعروں میں بھی شرکت کرتے رہے ۔ اُنھیں سب سے آخر میں پڑھوایا جاتا تھا ان کے آخری زمانے کے ایک مشاعرے کا حال قتیل نے لکھا ہے ۔ آواز پاٹ دار تھی اور لہجہ میں سوز واثر تھا ۔ کبھی جوانی میں شعر پڑھتے تو مشاعرے میں آہ و فغاں سے حشر کا سا منظر بپا ہو جاتا تھا ۔ خود ہی لکھتے ہیں :

یہ میر ستم کشتہ کسو وقت جواں تھا   انداز غزل کا سبب شور و فغاں تھا
جادو کی پڑی پرچۂ ابیات تھا اس کا   منھ تکیے غزل پڑھتے عجب سحر بیاں تھا
وہ دل زدہ دلّی میں جدھر کو بھی نکلتا   ساتھ اس کے قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا

میر کا آخری زمانہ

آخری زمانے میں پہلے اُن کی ایک جوان بیٹی کا انتقال ہوا ، دوسرے سال بیٹے ، میر فیض علی ، رحلت کر گئے اس سے اگلے سال بیوی داغ مفارقت دے گئیں ۔ ان متواتر صدموں نے میر کی کمر توڑ دی ۔ حواس میں خلل پیدا ہو گیا ۔ دانت پہلے ہی ٹوٹ چکے تھے ۔ بینائی بھی کمزور ہو گئی تھی چشمہ لگاتے تھے ۔

سماعت میں بھی فرق آگیا تھا۔ مزاج پہلے ہی سے تصوف آشنا تھا اب دنیا سے بالکل بیزار ہوکر گوشہ نشین ہوگئے۔ محفلوں میں جانا بند کر دیا۔ ربیع الثانی (مئی ۱۸۱۰ء) سے پُرانے امراض نے زور پکڑا۔ قولنج کا عارضہ بہت دنوں سے تھا وہ عود کر آیا جوڑوں میں درد رہنے لگا۔ جب یہ درد برداشت سے باہر ہوا تو شاہی طبیبوں نے یہ رائے ٹھہرائی کہ مسہل دیا جائے۔ قبض دور ہوگا تو درد میں کمی ہو جائے گی۔ مسہل دینا ہی غضب ہوگیا۔ ایک دن میں (۵۰) اسہال ہوگئے۔ دو تین دن اسی حالت میں گذرے آخر جمعہ ۲۰ شعبان ۱۲۲۵ھ (۲۰ ستمبر ۱۸۱۰ء) کو شام کے وقت لکھنؤ کے محلہ سٹھی میں انتقال کیا۔ اگلے دن دوپہر گئے قبرستان اکھاڑا بھیم میں اپنی بیوی اور بیٹی بیٹے کی قبروں کے پاس دفن کیے گئے۔ وہ جگہ اب ریلوے لائن میں آگئی ہے اور اس کا نشان قطعاً محو ہوگیا ہے۔ میرؔ نے پہلے ہی کہہ دیا تھا:

مت تربتِ میرؔ کو ہٹاؤ

رہنے دو غریب کا نشاں تو

اولاد

میرؔ کی پہلی شادی غالباً دہلی ہی میں ہوئی تھی اور ایک بیٹے فیض علی تھے جو اُن کے ساتھ ڈیگ، کاماں، کمھیر وغیرہ میں بھی رہے۔ سعادت خاں ناصر کا بیان ہے کہ اُنھوں نے لکھنؤ میں دوسری شادی کی تھی۔ اُن کے دوسرے بیٹے حسن عسکری عرف کلّو عرش تھے۔ ایک بیٹی بھی تھی جس کا حوالہ نوادر الکملا، کی عبارت میں ملتا ہے۔ بعض تذکرہ نگار اُسے بھی شاعرہ بتاتے ہیں اور کہتے ہیں بیگم تخلص تھا اور شادی سے تھوڑے ہی عرصے کے بعد اس نے انتقال کیا۔ میر کلّو عرشؔ بہت دنوں تک زندہ رہے۔ ان کا دیوان بھی مرتب ہوا تھا۔ محمد حسن آزاد نے انھیں دیکھا تھا۔ بے دماغی میں اپنے باپ

کے جانشین تھے۔ میر کلو عرشؔ کی رنگت سانولی کشیدہ قامت تھے اوسط کا جسم تھا۔ سر پر پٹے تھے اونچی چولی کا انگرکھا اور کلی دار پائجامہ استعمال کرتے تھے۔ گھیلا جوتا یا بوٹ پہنتے تھے آخر عمر میں بسبب پیرانہ سالی کمر خم ہوگئی تھی اور افیون بھی کھانے لگے تھے۔ ہر وقت آنکھیں بند رہتی تھیں۔ حقہ سامنے لگا رہتا تھا۔ شیخ محمد جان شاد (پیرِ میر)، اِن کے نامی شاگرد تھے وہ کہتے ہیں کہ میر کلو عرش روزانہ شام کو پانچ بجے تحسین کی مسجد کے چبوترے پر آکر بیٹھا کرتے تھے اور چاروں طرف شعراے نامی ہوتے تھے۔ بڑے نازک مزاج تھے کسی رئیس کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھتے تھے۔ پہلے رازؔ تخلص تھا بعد میں عرشؔ اختیار کیا۔ ان کا دیوان مطبع کارنامہ لکھنؤ سے چھپا تھا۔ یہ مشہور شعر اُن کے ہیں۔

آسیا کہتی ہے ہر صبح بآواز بلند
رزق سے بھرتا ہے رزّاق دہن پتھر کے
پھول اب رعشۂ پیری سے نہیں اٹھتا عرش
تولتے تھے کبھی ان ہاتھوں سے من پتھر کے

شاگرد

فنِ شاعری اور محاورہ و زبان کے بارے میں میرؔ کے اپنے معیار تھے اور ان پر سختی سے کاربند تھے۔ پھر اُن کے مزاج میں بڑا استغنا تھا اور نازک دماغ انسان تھے اس لیے اُن سے قریب آنے اور شاعری میں استفادہ کرنے کی جرأت ہر ایک کو نہ ہوتی ہوگی اور یہ بھی ہے کہ اُن کا فن عطیۂ خداوندی تھا اور اس میں اُن کے ذاتی حالات کو بھی بڑا دخل تھا۔ میرؔ کے اسلوب کو نبھانا محض مشق اور اکتساب سے ممکن نہیں تھا۔ اس لیے دوسرے اساتذۂ سخن (مثلاً مصحفی)، کے مقابلے

میں اُن کے شاگردوں کی تعداد کم ہی نظر آتی ہے. پھر بھی مختلف اوقات میں اُن سے اصلاح لینے والوں کی تعداد پچاس سے کم نہیں ہے اور اس فہرست میں یہ شعرا بھی شامل ہیں :

۱ - آغا حسین برگشتہ لکھنؤ

۲ - جسونت سنگھ پروانہ [وفات ۱۲۲۷ھ / ۱۸۱۲ء]

۳ - میر محمد حسن تجلی ولد میر محمد حسین کلیم

۴ - جان علی جان اکبرآبادی

۵ - غلام علی راسخ عظیم آبادی (وفات ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۳ء)

۶ - لالہ بندرابن راقم دہلوی

۷ - غلام حسین شکیبا دہلوی

۸ - متولال صفا لکھنوی

۹ - عاشور بیگ طالب

۱۰ - میر فیض علی فیض

۱۱ - مرزا اکبر علی خاں گل جے پوری

۱۲ - مرزا علی لطف

۱۳ - محمد محسن محسن خلف حافظ محمد حسن (برادرزادۂ میر)

۱۴ - میر عبدالرسول نثار (امروہہ میں مدفون) (وفات تقریباً ۱۱۷۶ھ)

۱۵ - محمد اکرم نزار

۱۶ - ذوالفقار علی صفا

۱۷ - میاں جگن

تصانیف

(الف) اردو : کلیاتِ میر :

اردو نثر میں میر کا لکھا ہوا کوئی ایک فقرہ بھی نہیں ملتا۔ البتہ انھوں نے اردو نظم کی مختلف اصناف خصوصاً غزل میں لازوال سرمایہ یادگار چھوڑا ہے۔

اُن کا تمام اردو کلام کلیات کی صورت میں یک جا ملتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

۱ - دیوان اوّل — اس میں ۵۶۰ غزلیں اور ۴۲۸۲ - اشعار ہیں۔

۲ - دیوان دوم — اس میں ۳۹۰ غزلیں اور ۳۴۱۶ - اشعار ہیں

۳ - دیوان سوم — اس میں ۲۵۳ غزلیں اور ۱۸۳۲ - اشعار ہیں

۴ - دیوان چہارم — اس میں ۲۱۹ غزلیں اور ۱۳۱۱ - اشعار ہیں

۵ - دیوان پنجم — اس میں ۲۵۸ غزلیں اور ۱۶۴۲ - اشعار ہیں

۶ - دیوان ششم — اس میں ۱۳۲ غزلیں اور ۱۰۹۵ - اشعار ہیں

اس طرح کلیات میر میں غزلوں کی کل تعداد ۱۸۱۸۔ اور غزلوں کے اشعار کی تعداد ۱۳۵۸۵ ہوتی ہے۔ دوسری اصناف سخن اس کے علاوہ ہیں۔

کلیات میر میں دوسری اصناف کا خاکہ اس طرح ہے۔

مثنویاں

میر نے تقریباً ۳۶ مثنویاں لکھیں۔ یہ اُن کی کلیات میں شامل ہیں۔ دو مثنویاں بعد میں دریافت ہوئیں۔ ان میں سے چند اہم مثنویاں یہ ہیں :

۱۔ خواب و خیال
۲۔ دریائے عشق
۳۔ معاملاتِ عشق
۴۔ مثنوی شعلۂ شوق
۵۔ در بیان کد خدائی آصف الدولہ
۶۔ مثنوی در جشن ہولی
۷۔ در تعریف سگ و گربہ
۸۔ در ہجو خانۂ خود
۹۔ در ہجو موسم برسات
۱۰۔ مثنوی اژدر نامہ
۱۱۔ در ہجو اکول

قصائد

اپنے زمانے کے رواج کے مطابق میر نے قصائد بھی لکھے ہیں۔ کلیات میر میں قصائد بھی شامل ہیں۔ لیکن یہ بات سچ ہے کہ قصیدہ میں میر اپنے ہم عصر استاد سودا سے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔

مراثی میر

میر کے مرثیوں کا ایک مجموعہ بعد کو دریافت ہوا جسے ڈاکٹر مسیح الزماں نے اپنے مقدمہ و تعارف کے ساتھ چھاپا ہے۔

کلّیاتِ میر کے نسخے

میرؔ کے چھ دیوانوں کے قلمی نسخے ملک کی مختلف لائبریریوں میں مل جاتے ہیں مگر اتنے بڑے شاعر کا کلام جتنی کثرت سے نقل ہونا چاہیے تھا اس اعتبار سے اِن قلمی نسخوں کی تعداد بہت کم ہے۔ دیوان چہارم کا ایک بہت اہم مخطوطہ جو میرؔ کی زندگی میں لکھا گیا تھا مہاراجا محمود آباد کے کتب خانے میں ہے جسے ڈاکٹر اکبر حیدری نے کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے اور یہی نقوش (لاہور) کے میرؔ نمبر (جلد دوم) میں بھی مکمل چھپا ہے۔ لیکن اس میں اشعار کو صحیح نہیں پڑھا جا سکا اور کوئی صفحہ غلط قرأت کی مثالوں سے خالی نہیں ہے۔

(ب) فارسی نثر

تذکرہ نکات الشعراء

فارسی نثر میں میر کا ایک اہم کارنامہ تذکرہ نکات الشعراء ہے، جس میں اُنھوں نے ریختہ (اردو) کے شعراء کا مختصر حال اور انتخاب کلام درج کیا ہے۔ اس کی تالیف ۱۱۶۴ھ اور ۱۱۶۸ھ (یعنی ۱۷۵۱ء ــ ۱۷۵۵ء) کے درمیان ہوئی۔ اس وقت میرؔ کی عمر ۳۰ سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ اردو شعراء کا پہلا تذکرہ ہے۔ اگر اسے قطعی طور پر تسلیم نہ بھی کیا جائے تو اس میں کچھ شک نہیں کہ شعرائے اردو کے ابتدائی تذکروں میں سے ایک ہے اور تذکروں کے تمام ذخیرے میں منفرد خصوصیات کا حامل ہے۔ اس کے قلمی نسخے زیادہ نہیں ملتے، اور یہ تین بار شائع بھی ہوا ہے۔

پہلی بار ۱۹۲۹ء میں انجمن ترقی اردو اورنگ آباد نے نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے مقدمے کے ساتھ شائع کیا تھا۔ پھر مولوی عبدالحق کے مقدمہ کے ساتھ ۱۹۳۶ء میں انجمن ہی سے دوبارہ چھپا۔ اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہوا ہے۔

اپنے معاصرین کے بارے میں میرؔ کے خیالات اور فن شاعری میں اُن کے تنقیدی نظریات کو سمجھنے کے لیے نکات الشعراء ایک اہم اور بنیادی ماخذ ہے۔

۲۔ ذکرِ میرؔ

میرؔ کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ اردو کے پہلے شاعر ہیں جس کی خود نوشتہ سوانح عمری ہمیں ملی ہے۔ اُنھوں نے ذکر میرؔ فارسی زبان میں لکھی ہے اور ابتداء میں ان کا مقصد جدید فارسی محاورہ و روزمرّہ کے استعمال کا مظاہرہ کرنا معلوم ہوتا ہے آگے بڑھ کر جب وہ تاریخی واقعات کے بیان پر آ گئے ہیں تو اس کا اسلوب ایک تاریخ کی کتاب کا سا ہو گیا ہے۔ کتاب کے آخری حصّے میں انھوں نے بہت سے تاریخی واقعات کو اختصار کے ساتھ ایک دو پیراگراف میں بیان کرنے کی سعی کی ہے تو اس کا انداز ایک ڈائری کے اندراج کا سا ہو جاتا ہے۔ فارسی اچھی ہے اس میں پختگی بھی ہے اور سلاست بھی۔ یہ کتاب پچاس سال کے واقعات کا احاطہ کرتی ہے یعنی مارچ ۱۷۳۹ء میں حملہ نادر شاہ سے لے کر مارچ ۱۷۸۹ء میں غلام قادر روہیلہ کے قلعہ دہلی پر تسلط اور پھر اس کی گرفتاری اور قتل کے بیان پر ختم ہوتی ہے۔ سر جادو ناتھ سرکار کی کتاب "فال آف دی مغل ایمپائر" بھی اِنھیں پچاس برسوں کے واقعات کی تفصیل بیان کرتی ہے۔

میرؔ بہت سے واقعات کے چشم دید راوی ہیں اور اکثر مہمات میں شریک رہے ہیں بہت سے حادثات کا ان پر براہ راست اثر پڑا ہے۔ وہ یہ کتاب اپنی ذاتی پسند سے لکھ رہے ہیں کسی نے اِس کے لکھنے پر انھیں مامور نہیں کیا ہے، واقعات کے بیان میں ان کی جانب داری، تعصب یا غلط بیانی کا بھی کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا ہے اس لیے ذکر میرؔ اس دور کے تاریخی ماخذ کی حیثیت سے بھی بہت کارآمد اور قابلِ اعتبار کتاب ہے لیکن ہمارے مورخوں نے اس سے ابھی تک ایسا استفادہ نہیں کیا ہے جیسا کرنا چاہیے تھا۔

اس کتاب کے صرف ۴ - ۵ قلمی نسخے دستیاب ہیں :

۱ - نسخہ جواہر میوزیم (اٹاوہ) جو اب علی گڑھ میں ہے۔

۲ - نسخہ مولوی محمد شفیع (لاہور)

۳ - نسخہ رضا لائبریری (رام پور)

۴ - نسخہ پروفیسر مسعود حسن رضوی (لکھنؤ)

۵ - نسخہ (گوالیار)

اس کا اردو میں خلاصہ کر کے سہ ماہی رسالہ اردو میں مولوی عبدالحق نے چھاپا تھا۔ پھر اُن کے مقدمہ کے ساتھ فارسی متن ۱۹۲۹ء میں چھپا۔ یہ صرف دو نسخوں کی مدد سے تیار کیا گیا تھا۔ کتاب کے آخر میں کچھ لطائف بھی تھے جن میں بعض فحش تھے اس لیے انھیں حذف کر دیا گیا۔ متن کی پوری طرح تصحیح نہیں ہو سکی اس لیے غلطیاں رہ گئی ہیں۔ اس کی فارسی بھی ہندستانیوں کے لیے کہیں کہیں اجنبی سی ہے اس وجہ سے ترجمہ میں بھی ٹھوکریں کھائی گئیں۔

راقم الحروف نے اُردو میں پہلی بار پوری کتاب کو منتقل کیا اور یہ "میر کی آپ بیتی" کے نام سے ۱۹۵۷ء میں مکتبہ برہان دہلی نے شائع کی۔ اب اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۶ء میں انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی سے اور اسی سال مجلس ترقی ادب لاہور سے ایک ساتھ شائع ہوا ہے اس میں فارسی متن بھی ممکن حد تک صحیح کرکے شامل کر دیا گیا ہے۔

اسی "میر کی آپ بیتی" کو کسی نے ہندی میں بھی منتقل کیا ہے اور وہ ہندی ترجمہ الٰہ آباد سے شائع ہوا ہے۔ مگر اُس میں یہ اعتراف نہیں کیا کہ اُردو ترجمہ کو ہندی رسم الخط میں منتقل کیا گیا ہے۔

۳۔ فیضِ میر

میر نے اپنے بیٹے میر فیض علی کی تعلیم کے لیے ایک رسالہ فارسی نثر میں لکھا تھا جس میں بعض حکایات درج کی ہیں۔ اسے انھوں نے "فیضِ میر" نام دیا۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی نے اسے مرتب کیا اور ایک عالمانہ مقدمہ کے ساتھ "ادبستان" لکھنؤ سے چھاپا۔ اب تک اس کے تین چار ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ ساتھ ہی اس کا ترجمہ بھی درج کر دیا گیا ہے۔

۴۔ قصہ دریاے عشق (نثر)

میر نے اپنی اردو مثنوی دریاے عشق میں جو قصہ نظم کیا ہے اسے انھوں نے فارسی نثر میں بھی لکھا تھا۔ یہ مدتوں ناپید رہا۔ مولوی امتیاز علی عرشی رامپوری نے اسے ایک مختصر تعارف کے ساتھ پہلی بار دلّی کالج اردو میگزین کے میر نمبر (۱۹۶۲ء) میں شائع کروایا تھا۔

۵ - دیوان فارسی

فارسی نظم میں میرؔ کا سرمایہ ایک دیوان ہے جو خاصا ضخیم ہے اس کے چند قلمی نسخے دستیاب ہیں۔ یہ ابھی تک شائع نہیں ہوا تھا لیکن اب ڈاکٹر نیر مسعود رضوی نے اسے مرتّب کر کے نقوش (لاہور) کے میر نمبر میں شائع کر دیا ہے۔ میرؔ کی فارسی شاعری کے بارے میں دو چار ہی مضامین لکھے گئے ہیں اس دیوان کی اشاعت کے بعد اس کا اور زیادہ گہرا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کرنا ممکن ہو سکے گا۔

اردو اور فارسی نظم و نثر میں میرؔ کا تصنیفی سرمایہ یہی ہے۔ اُن کی حیات اور شاعری پر ابھی تک کوئی اعلا درجے کا کام نہیں ہوا۔ لیکن نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی نے کلام میرؔ کا ایک اچھا انتخاب مزامیر کے نام سے دو جلدوں میں شائع کرایا تھا (۱۹۴۷ء) اور جلد اوّل کے ساتھ ایک مفصّل عالمانہ مقدمہ بھی شامل تھا۔ انھوں نے میرؔ کی شاعری پر مختلف اوقات میں بعض اچھے تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔

ایک "انتخاب کلام میرؔ" مولوی عبدالحق نے تیار کیا تھا جسے انجمن ترقی اردو ہند نے چھاپا اور اب تک اس کے متعدّد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ میرؔ کے انتخابوں میں سب سے زیادہ مقبول یہی ہوا ہے۔

ڈاکٹر سیّد عبداللہ (لاہور) میرؔ کے ناقدوں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ اُن کے مضامین کا مجموعہ نقد میرؔ (۱۹۸۵ء) بہت قابل قدر ہے اور میرؔ کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

راقم الحروف نے مختلف مضامین میرؔ کی شخصیت اور شاعری کے مبہم اور مجہول گوشوں سے متعلق لکھے ہیں جو ایک مجموعہ کی شکل میں "تلاشِ میرؔ" کے نام سے مکتبہ جامعہ لیٹڈ نئی دہلی نے ۱۹۷۴ء میں شائع کیے تھے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی نے ۱۹۹۴ء میں شائع کر دیا تھا تیسرا ایڈیشن طباعت کے لیے تیار ہو رہا ہے۔ کلام میر کی فرہنگ ڈاکٹر فرید احمد برکاتی نے "فرہنگ کلیاتِ میر" کے نام سے ۱۹۸۸ء میں شائع کی تھی۔

میرؔ سے متعلق مندرجہ ذیل چند کتابیں بھی قابل قدر ہیں:

(۱) میر تقی میر : ڈاکٹر جمیل جالبی ۔ ۱۹۸۰ء
(۲) نقوش (لاہور) میر نمبر ۱۹۸۲ء دو جلدیں
(۳) دلّی کالج میگزین (میر نمبر) ۱۹۶۳ء (مرتبہ نثار احمد فاروقی)
(۴) عیارستان ۔ قاضی عبدالودود
(۵) میر کی امیجری کا مطالعہ از پروفیسر قاضی افضال حسین
(۶) مثنویات میر : سر شاہ سلیمان
(۷) مراثی میر : مرتبہ مسیح الزماں
(۸) میر و مصحفی : پروفیسر حنیف نقوی
(۹) تلامذہ میر : امداد صابری
(۱۰) میر اور میریات : نادم سیتاپوری
(۱۱) شعر شور انگیز : شمس الرحمٰن فاروقی

دوسرا باب

میر کا فن

میرؔ نے جس زمانے میں آنکھ کھولی وہ مغلیہ سلطنت کے زوال کا زمانہ تھا، اور وہ اپنی پوری زندگی یعنی نوّے سال تک اس زوال کا مشاہدہ کرتے رہے۔ اس زمانے میں ایران سے شعرا کی نئی کھیپ بھی آرہی تھی اور ہندستانی فارسی دانوں کا اعتبار گھٹتا جارہا تھا۔ فارسی علمی زبان تھی اور خواص تک محدود تھی۔ عوامی زبان وہ تھی جسے گلی کوچوں اور میلوں ٹھیلوں میں بولا جاتا تھا اور جس کی پوری قوت بعد کو نظیر اکبر آبادی کے کلام میں ظاہر ہوتی ہے۔

میرؔ کے زمانے میں ریختہ گوئی، یعنی عوامی زبان میں شعر کہنے کا رواج تو شروع ہو گیا تھا لیکن فارسی اسالیب کے اثر سے یہ ابتدائی دور کے اردو شعرا بھی لفظی رعایت اور ایہام کے پیچھے بھاگتے تھے۔ اس زمانے میں ایسے اشعار پر پھبتیں اُڑا یا کرتی تھیں :

چھاج سی داڑھی لگا کر شیخ جی
اس کے کوچے میں نہ پھٹکا کیجیے

لیکن میرؔ نے ایہام سے ہٹ کر ایک نیا طرز اختیار کیا جسے وہ "انداز" کہتے ہیں۔ اس میں

تمام صنعتیں آجاتی ہیں تجنیس، ترصیع، صفائے گفتگو، فصاحت، بلاغت، ادا بندی، خیال وغیرہ۔

میر ایک خوش فکر شاعر ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ اُن کے فکر میں بلند پروازی نہ ہو یا وہ محض تقلید ہی کے سہارے زندہ ہوں۔ جہاں تک انھوں نے شاعری کی قدیم روایات کی پاسداری کی ہے وہاں وہ 'تقلید' کرتے بھی نظر آتے ہیں لیکن ان کی اجتہادی شان ان کی تقلید پر غالب رہتی ہے۔

اس کے علاوہ اُن کا ذخیرۂ الفاظ بھی دوسرے ہم عصر شعراء کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ سودا خود ایک قادر الکلام شاعر ہے اور اس نے اساتذۂ فارسی کی ٹکر کے قصائد لکھے ہیں۔ مگر اردو کے وہی الفاظ جو سودا نے برتے ہیں میر کے شعروں میں آتے ہیں تو اُن میں نئی وسعت اور نئے پہلو پیدا ہو جاتے ہیں۔ اسی کو قدیم اصطلاح میں "نادرہ گوئی" کہتے ہیں کہ مانوس لفظوں سے نامانوس مفہوم پیدا کر دیا جائے۔

میر کی شاعری میں تلاشِ الفاظ کی بڑی اہمیت ہے۔ وہ لفظوں کے مزاج سے واقف ہے اور معانی کے نہایت نازک فرق کو خوب سمجھتا ہے۔ میر کا خیال ہے کہ "ایہام کی طرف میلان یا لفظوں کی بازی گری شعر کو بے رتبہ بنا دیتی ہے"۔ اعلیٰ درجے کی شاعری کے لیے اسلوب کی حیثیت ثانوی ہے اصل چیز شعر کی معنوی فضا کا رکھ رکھاؤ ہے یعنی اس میں لطافت ہو، دردمندی ہو، خیال کی ندرت ہو، فکر کی گہرائی ہو اور وہ بات جسے ایک لفظ میں میر بار بار دہراتا ہے یعنی "مزہ" یہ بنیادی وصف ہے۔ اس کے بعد اس کی اہمیت ہے کہ پیرایۂ اظہار میں شائستگی ہو، زبان میں بازاری پن یا لب و لہجہ میں ابتذال نہ ہو۔ بعض متقدمین شعراء کے یہاں کمتر اور لکھنؤ کے شعرائے متاخرین کے کلام میں بیشتر جو "چونچلا" پایا جاتا ہے اس کو میر پسند نہیں کرتا اور زبانِ لوطیاں یا پوچ گوئی یا زبان

اوباشاں جیسے الفاظ سے یاد کرتا ہے۔" (تلاش میر ۳۵)

میرؔ کی شاعری کا ایک حصّہ وہ ہے جس میں لفظی رعایت بھی ہے اور تشبیہوں کی ندرت بھی۔ لب و لہجہ پاکیزہ اور بیان شایستہ ہے۔ اسی طرح کی شاعری میں میرؔ کے فنی کمال کا بھرپور اظہار ہوتا ہے مثلاً :

چلتے ہو تو چمن کو چلیے، سنتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں، پھول کھلے ہیں، کم کم باد و باراں ہے

یہ مشہور مطلع ہے۔ زبان کتنی آسان ہے جسے ہر سطح کا انسان سمجھ سکتا ہے۔ شعر کا اُٹھان مکالمے سے ہوتا ہے۔ "چلتے ہو تو" کہہ کر مخاطب کو اپنے ذہنی سفر میں شریک کر لیتا ہے۔ "سنتے ہیں" کا ٹکڑا اس کیفیت کو پورے ماحول سے جوڑ دیتا ہے۔ پھر بہاراں کی کیفیت کا جس طرح لفظوں میں اظہار ہوا ہے وہ تصویر میں بھی شاید ممکن نہ ہوتا اس لیے کہ "کم کم" کی کیفیت کو مُوقلم سے دکھانا اتنا آسان نہیں تھا۔

میرؔ کبھی اپنے ماحول سے خطاب کرتا ہے، کبھی پوری کائنات سے سرگوشیاں کرتا سنائی دیتا ہے، کبھی صرف اپنے آپ سے مخاطب ہے، کہیں تفصیل میں اِجمال کا جمال دکھاتا ہے اور کبھی اجمال میں تفصیل کے رنگ بھر دیتا ہے۔ زبان و بیان پر یہ قدرت ہر شاعر کو نصیب نہیں ہوتی اور مشاہدہ و اظہار کی اسی قدرت نے اس کی قوت متخیلہ کو بہت تیز بیں اور دور رس بنا دیا ہے۔ جتنی رنگا رنگ، متحرک اور مختلف جہات والی امیجری ہمیں میرؔ کی شاعری میں ملتی ہے وہ متقدمین و متاخرین شعراء میں سے اور کسی کے ہاں نظر نہیں آتی یہ اس امیجری کے زور و قوت کا ادنیٰ سا کرشمہ ہے کہ وہ مجرّد ABSTRACT اشیاء کو بھی آنکھوں سے دکھا سکتا ہے۔

صبح وہ آفت اُٹھ بیٹھا تھا، تم نے نہ دیکھا صد افسوس
کیا کیا فتنے سر جوڑے پلکوں کے سائے سائے گئے

اس شعر میں "منظر" بھی ہے اور زمان و مکان بھی۔ مکالمہ بھی ہے۔ ٹریجڈی کا عنصر بھی۔ حیرت یعنی (SUSPENCE) بھی ہے اور حرکت بھی۔ اور یہ سارے عناصر وہ ہیں جنھیں ایک ڈرامے کا لازمی حصّہ تسلیم کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے ایک شعر میں پورا ڈراما محصور کر دیا گیا ہے۔ "فتنے" ایک مجرّد شئے کا اظہار ہے لیکن ان میں حرکت پیدا کر کے اُنھیں مجسّم کر دیا ہے۔ یہ شاعرانہ آرٹ کا کمال ہے۔

میرؔ نے بعض اشعار اپنے عہد کے معیار و مذاق کی رعایت سے کہے ہیں اُن میں کوئی بلندی یا ندرت نہیں ہے۔ لیکن جہاں وہ اپنے "انداز" پر چلتے ہیں وہاں یہ معیار بھی نبھ جاتے ہیں۔ ایہام یا رعایت لفظی ایسی خوبی سے شعر میں گھر بناتے ہیں کہ بغیر تامّل کیے اُنھیں پانا آسان نہیں ہوتا مثلاً:

تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میرؔ
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

یہاں حُور، بہشت، قصور، فہم، سمجھے، سب الفاظ ایک دوسرے کی رعایت سے آئے ہیں اور صرف غور کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ "حور و قصور" میں کوئی لفظی رشتہ بھی موجود ہے۔

میرؔ نے اپنی غزلوں میں بحروں اور زمینوں کا انتخاب بھی ایسی چابک دستی سے کیا ہے کہ غزل کا جو (MOOD) ہے اسی کی مناسبت سے بحر میں اتار چڑھاؤ پیدا ہوتا ہے وہ مختصر بحروں میں بھی وسیع جذبات کو سمو دیتا ہے۔

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

وصل اس کا خدا نصیب کرے
میرؔ جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

اسی طرح طویل بحروں میں اتنا (RYTHM) اور گٹھاؤ پیدا کر دیتا ہے کہ تمام الفاظ یک جان دو قالب بن جاتے ہیں۔ اسے پڑھتے ہوئے زیر و بم اتنے متناسب واقع ہوتے ہیں جیسے میرؔ کمیت گھوڑے کی رفتار سے تشبیہ دیتا ہے۔ وہ الفاظ کو اتنا گتھم گتھا کر دیتا ہے کہ پڑھنے والا پورا مصرع پڑھنے سے پہلے اٹک ہی نہیں سکتا، ٹھہرے گا تو مصرع کا خون ہو جائے گا۔ مثلاً یہ مصرع آپ اٹک اٹک کر پڑھیے:

سارے رند اوباش جہاں کے تجھ سے سجود میں رہتے ہیں
بانکے ٹیڑھے ترچھے تیکھے سب کا تجھ کو امام کیا

ایک حرف کی آواز ختم نہیں ہو پاتی جو اسی میں سے دوسرے حرف کی صدا نکلنے لگتی ہے۔ یہ انتخاب الفاظ کا نہایت زبردست ملکہ اور قدرت سخن کی بات ہے۔

لفظوں کی نشست سے میرؔ کتنا باخبر ہے اس کا اندازہ ایک معمولی سی مثال سے ہوسکتا ہے شعر میں وزن ہی ایک بنیادی خصوصیت ہے۔ اگر کسی لفظ کو زیادہ کھینچ دیا جائے یا اسے پورا نہ پڑھا جائے تو شعر اتنا متاثر ہوتا ہے کہ وزن سے ساقط معلوم ہونے لگتا ہے مثلاً یہ شعر ہے :

کس کو فرصت جو حالِ میرؔ سنے
رنگ ہی اور کچھ ہے مجلس کا

اس شعر میں لفظ میرؔ کو زیادہ کھینچ کر پڑھیے، یہ محسوس ہوگا کہ وزن سے گرا جارہا ہے لیکن ذیل کے مقطع میں یہی لفظ اس طرح آیا ہے کہ آپ اسے چاہے جتنا کھینچ لیں وزن پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

گیا تھا اس کی گلی میں سو پھر نہ پلٹا میرؔ
میں میرؔ میرؔ اس کو بہت پکار رہا

میرؔ میرؔ کو کھینچ کر پڑھیں تو آواز اور صدائے بازگشت دونوں سنائی دیتے ہیں اور ___ "بہت پکار رہا" کا ٹکڑا اس انداز سے آیا ہے کہ لہجہ سے مایوسی، تھکن اور عاجزی ظاہر ہو جاتی ہے۔

میرؔ کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ معمولی الفاظ سے غیر معمولی کام لیتا ہے۔ جو الفاظ امدادی طور پر آتے ہیں، یا بہت زیادہ استعمال ہوتے ہیں، ان میں کتنے وسیع امکانات پوشیدہ ہیں ہم نے کبھی اس پر غور بھی نہ کیا ہوگا، مگر میرؔ انھیں چھوٹے چھوٹے بہت معمولی، کثیر الاستعمال اور حقیر لفظوں سے اپنے آرٹ میں ایسی زبردست خدمت لے لیتا ہے کہ یہی الفاظ بُنیادی اہمیت کے بن جاتے ہیں۔ سا، سی، تِس، کچھ، تئیں، ٹک وغیرہ کتنے معمولی لفظ ہیں۔ لیکن ان کی قوت اور تاثیر کو ان اشعار میں جانچیے :

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

یک وہم نہیں بیش مری ہستیِ موہوم
تس پر بھی تری خاطر نازک پہ گراں ہوں

وصل اس کا خدا نصیب کرے
میرؔ جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

یک نگہ سے بیش کچھ نقصاں نہ آیا اس کے تئیں
اور میں بے چارہ تو اے مہرباں مارا گیا

مصرع: ٹک ہونٹھ ہلا تو بھی کہ اک بات ٹھہر جائے

میرؔ کی شاعری کے اسلوب پر جتنا غور کریں ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ وہ لفظوں کا مصوّر ہے ایک نہایت ماہر فن کار جو CANVAS پر موقلم سے ایک تصویر بناتا ہے، وہ جانتا ہے کہ اس تصویر میں جہات (DIMENSIONS) کس طرح دکھائی جائیں، کون سا رنگ شوخ ہو، کون سا ہلکا ہو، کہاں

وضاحت کی ضرورت ہے، کدھرا بہام درکار ہے. مصوّر اپنی قوّتِ متخیّلہ (IMAGERY) کو تصویر کے پردے پر اُتارتا ہے اور اس کو دیکھنے والے کی قوّت باصرہ پر بہت کم اعتماد ہوتا ہے، اس لیے وہ یہ توقع نہیں کرسکتا کہ جو خط اس نے تصویر میں نہیں کھینچا ہے اُسے بھی دیکھنے والا دیکھ سکے گا۔ اس کے لیے قرینہ پیدا کرنا ضروری ہوجاتا ہے. لیکن ایک شاعر کو اپنے مخاطب کی سماعت سے کام لینا ہوتا ہے۔ وہ آواز اور نغمگی کے زیر و بم سے جذبات وکیفیات کی عکاسی کرسکتا ہے. مصوّر بصارت کے ساتھ سماعت کو شریک نہیں کرسکتا لیکن شاعر میں اگر غیر معمولی سلیقہ موجود ہے تو وہ بصارت وسماعت دونوں سے کام لے سکتا ہے مثلاً میرؔ کہتا ہے:

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

یہاں سنگ ایسی جگہ واقع ہوا ہے کہ اسے خاص انداز سے پڑھیے تو ایسا محسوس ہوگا کہ زندانی نے پہلا مصرع پڑھا اور پتھر اٹھا کر اپنے سر پر اپنے ہی ہاتھ سے مارلیا۔

رعایت لفظی سے کھیلنا شاعر کے لیے ایک خطرناک مشغلہ ہے۔ وہ اگر لفظوں کے پیچھے بھاگے گا تو جذبے کی صداقت کافور ہوجائے گی۔ لیکن میرؔ نے یہ کھیل بڑے سلیقے کے ساتھ نبھایا ہے۔ وہ جذبہ کی شدّت کو لفظوں کے بل سے ابھار دیتا ہے۔

اس کی قوتِ مشاہدہ بھی زبردست ہے اور اپنے گرد وپیش کے اُن مظاہر سے جنھیں ہم معمولی سمجھ کر نظر انداز کرجاتے ہیں وہ اپنے شعر کی غیر معمولی فضا تعمیر کرلیتا ہے۔ مثلاً:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

شعر کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا ایک نازک مقام ہے یہاں ہر سانس احتیاط اور دانش مندی کے ساتھ خرچ کرنا چاہیے لیکن اس کی تشبیہ میں اس نے واقعیت اور ندرت کو جمع کر دیا ہے' کارگہ شیشہ گری' کا مفہوم ہے شیشہ سازی کا کارخانہ۔ لیکن آج اس امیجری کو ہر شخص آسانی سے نہیں سمجھ سکتا۔ اسے واضح کرنا ضروری ہے۔ پہلے زمانے میں شیشے کے برتن اس طرح بنائے جاتے تھے کہ شیشہ کو ایک بڑے کڑھاؤ میں پکایا جاتا تھا' یہاں تک کہ وہ بالکل رقیق ہو جاتا تھا۔ جو برتن بنائے جاتے تھے ان کے سانچے لکڑی کے ہوتے تھے اس طرح کہ وہ بالکل نصف حصے سے کھُل جاتے تھے اور جوڑنے پر اُن میں صرف ایک باریک سوراخ باقی رہتا تھا۔ اب شیشہ بنانے والا کاری گر ایک لمبی سی نلکی اس کھولتے ہوئے کڑھاؤ میں ڈال کر اپنا سانس اوپر کھینچتا تھا تاکہ وہ سیّال شیشہ نلکی میں بھر جائے اور پھر نلکی کو سانچے کے منھ پر رکھ کر اپنا سانس آہستہ آہستہ اتارتا تھا تاکہ سانچے کے ہر گوشے میں یکساں طور پر سیّال شیشہ پہنچ جائے جب پورا سانچا شیشے سے بھر جاتا تھا تو اُسے ٹھنڈا کرنے کے بعد سانچا کھولتے تھے اور بنا بنایا برتن نکل آتا تھا۔ اس کام میں بنیادی اہمیت سانس ہی کی تھی اور صرف ایک ماہر اور محتاط کاری گر ہی اسے بنا سکتا تھا۔ اس لیے کہ اگر اُس نے زور سے سانس کھینچا تو سیّال شیشہ اس کے منھ میں آکر اُسے ہلاک کر سکتا تھا اور اگر سانس چھوڑتے وقت زیادہ زور دکھایا تو سانچے میں برتن کا ایک حصّہ موٹا ایک پتلا ہو سکتا تھا جس سے وہ برتن ہی بھدّا اور بے ڈول ہو جائے۔ میرؔ نے کارگہ شیشہ گری کے اس اپنے مشاہدے کو ایک فلسفیانہ رنگ دے کر نہایت اعلیٰ پائے کا شعر اپنے فکری سانچے میں ڈھال لیا ہے۔

اپنے ماحول کے علاوہ وہ انسان کی نفسی کیفیات کا بھی گہرا احساس رکھتا ہے۔ ایک پریشان حال انسان حالتِ اضطرار میں کس کس طرح سوچتا ہے اور بعض ایسے امکانات پر بھی اس کی نگاہ پہنچتی ہے جو عام حالت میں پیشِ نظر نہ ہوتے۔ میرؔ کہتا ہے :

ترے فراق میں، جیسے خیال مفلس کا
گئی ہے فکرِ پریشاں کہاں کہاں میری

اس میں "جیسے خیال مفلس کا" محض روایتی تشبیہ نہیں ہے یہ ایک گہرے تجربے اور نفسیاتی مشاہدے کی گواہ بن کر آتی ہے۔

میرؔ کو زمانہ بھی ایسا ملا جہاں شخصیتوں کے نقش بگڑ رہے تھے۔ ایسے ماحول میں کسی صلاحیت کو پنپنے کا موقع نہیں ملتا، لالۂ صحرائی کی طرح اپنے جمال سے خود ہی شرمندہ ہونے والے اس طرح گذر جاتے ہیں کہ کوئی ان کا ماتم کرنے والا نہیں ہوتا۔ میرؔ نے اپنی شخصی کیفیتوں کو اس طرح بیان کیا ہے کہ وہ پورے ماحول کا آئینہ بن کر ہمارے سامنے آئی ہیں اور ماحول یا معاشرے کی تصویر کشی اس طرح کی ہے کہ ہم اُن کی ذات کو اس میں آسانی سے تلاش کر سکتے ہیں۔ ایسے اشعار کلامِ میرؔ میں اتنی کثرت سے ہیں کہ مثالیں دینے کی ضرورت نہیں، لیکن یہاں چند شعر لکھ کر اس خصوصیت کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے :

دل تاب ہی لایا نہ ٹک جو یاد رہتا ہم نشیں
اب عیش روزِ وصل کا ہے جی میں بھولا خواب سا

شہرِ دل ایک مدت اجڑا بسا غموں میں
آخر اجاڑ دینا اس کا قرار پایا

جن بلاؤں کو میرؔ سنتے تھے ان کو اس روزگار میں دیکھا

دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا

ان سب اشعار میں جو اوپر لکھے گئے ہیں فن کارانہ کمال کا بہترین اظہار ہوا ہے۔ "اجمال میں تفصیل" میرؔ کا خاص ہنر ہے، وہ کسی نہایت وسیع، شدید اور بے پناہ احساس کے صرف ایک گوشے سے نقاب اٹھاتا ہے اور پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اس لیے میرؔ کے کلام میں ایجاز کا اعجاز جتنی بھرپور قوت سے ظاہر ہوتا ہے وہ اردو کے کسی دوسرے شاعر کے ہاں نہیں مل سکتا۔ لطف یہ ہے کہ اس تصویر کشی کے لیے وہ بہت ہی سادہ، عام فہم اور سامنے کے الفاظ سے کام لیتا ہے۔ اس خوبی کو یہاں تھوڑے سے موازنے اور مقابلے سے واضح کیا جائے تو بہتر ہوگا۔ عاشق کا دل ایک جہانِ آرزو ہوتا ہے۔ غالب کہتا ہے:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

بہت اچھا شعر ہے اور کیفیت کی سچّی تصویر کشی کر رہا ہے، عبدالرحیم خان خاناں اپنے فارسی شعر میں اسی کیفیت کو یوں بیان کرتا ہے:

شمار شوق نہ دانستہ ام کہ تا چند است
جز ایں قدر کہ دلم سخت آرزومند است

لیکن میرؔ نے ایک چھوٹی سی بحر کے معمولی لفظوں میں اپنا وہی " اجمال میں تفصیل " اور ایجاز میں اعجاز والا اسلوب یوں استعمال کیا ہے کہ اس کا شعر غالبؔ اور خان خاناں کے شعر سے اپنی کیفیت، وسعت اور گرفت میں کہیں آگے نکل گیا ہے :

وصل اس کا خدا نصیب کرے
میرؔ جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

پہلے مصرع میں اس وصل کے دشوار ہونے کا ذکر نہیں کرتا، صرف دعا مانگتا ہے، لیکن اس میں یہ مفہوم خود بخود آ گیا ہے کہ وصل ایسا آسان نہیں ہے، خدا ہی نصیب کرے تو ہو سکتا ہے۔ پھر اگر وصل ہوا تو کیا کرے گا، یہ بھی نہیں بتاتا۔ نہ غالبؔ کی طرح ہزاروں خواہشوں کے ہونے اور ہر خواہش پر دم دینے کا ذکر کرتا ہے، نہ خان خاناں کی طرح " شمارِ شوق " اور " سخت آرزومند " ہونے کا اعلان کرتا ہے، ان دونوں شاعروں نے اپنے شعر میں دوسروں کو خطاب کیا ہے، میرؔ خود کلامی کر رہا ہے اور " جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ " کہہ کر سب کچھ کہہ جاتا ہے، اس لیے کہ جس سے اس کا خطاب ہے (یعنی خود سے) وہ خوب اچھی طرح جانتا ہے کہ جی میں کیا کیا ہے!

ہمارے شعرائے متقدمین میں اکثریت ایسے شاعروں کی ہے جنھوں نے شاعری کو ایک فن یا صناعی سمجھ کر برتا ہے۔ شعر کہتے ہوئے اُن کے شعور یا تحت الشعور میں یہ ہوتا ہے کہ وہ زبان پر اپنی قدرت، شعر کی دروبست سے گہری واقفیت، استادانہ مہارت اور تلاشِ الفاظ و معنی میں اپنے فکر کی ندرت کا مظاہرہ

کریں، خواہ جذبہ میں سچائی اور مضمون میں گہرائی ہو یا نہ ہو۔ اس لیے ان کے اشعار میں ہیئت یعنی فارم زیادہ اہم ہو جاتی ہے اور معانی یا CONTENTS ثانوی حیثیت میں آجاتے ہیں۔ میر نے شعر کو فن تو سمجھا ہے لیکن اسے اپنی ذات کے اظہار کا پردہ بنایا ہے:

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا
وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

لیکن اس کی توجہ شعر کے ظاہری قالب سے زیادہ اس کی معنویت پر رہتی ہے۔ اس نے جہاں لفظی تناسب کا خیال رکھا ہے (اور اکثر رکھا ہے) وہاں بھی اس کی صناعی اور فن کاری معنویت پر غالب نہیں آتی ہے۔ بلکہ اس سے شعر کے بنیادی احساس کو تقویت ملتی ہے۔ خیالات کا تسلسل یا ASSOCIATON OF THOUGHT جدید علم نفسیات کا ایک مسلّمہ اُصول ہے کہ ایک بات سے دوسری بات یاد آتی ہے، میر بھی الفاظ کو ایسے تناسب سے جمع کرتا ہے کہ اُن کے ربط باہمی سے خیال کا ایک بڑا CANVAS بن جاتا ہے اور ہر لفظ دوسرے متناسب لفظ کی قوّت میں اضافے کا باعث ہوتا ہے۔ یہاں ایک دو شعروں کی تشریح و تحلیل سے میر کی فن کارانہ چابک دستی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

وصل و ہجراں یہ جو دو منزل ہیں راہِ عشق کی
دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا

وصل، ہجراں، عشق، دل، ایک قبیل کے الفاظ ہیں جن میں معنوی مناسبت موجود ہے۔ منزل، راہ، غریب، مارا گیا، ان لفظوں کا باہم تلازمہ ہے جو ظاہر ہے۔ عشق کو وہ ایک دشوار گذار سفر سے تشبیہ دیتا ہے جس میں ایک ایسا مسافر جا رہا ہے جسے نہ راستے کے نشیب و فراز کا علم ہے، نہ کوئی اس

کا رفیقِ سفر ہے۔

یہ ایک طویل سفر ہے جس کا انت بھی معلوم نہیں۔ لمبی راہ کے مسافر جگہ جگہ پڑاؤ ڈالتے ہوئے چلتے ہیں جنھیں "منزل" کہا جاتا ہے۔ عشق میں وصل یا ہجر بھی مقصود نہیں، منزل ہیں۔ راہ ایسی ہلاکتوں بھری ہے کہ مسافر کہیں بھی، راہ میں یا منزل میں کام آسکتا ہے اور "خدا جانے کہاں مارا گیا" سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اس ہلاکت یا اسباب ہلاکت کا سراغ بھی نہیں ملتا کیونکہ راہِ عشق کا ہر مسافر تنہا ہے، کوئی اس کا شریکِ درد نہیں ہے۔

اب شعر کا لفظی و معنوی تجزیہ کر کے دیکھیے تو سادہ سے لفظوں میں ایک پوری کائنات پوشیدہ ہے۔ فلسفۂ عشق، کیفیت ہجر و وصال، عاشق کے طویل جذباتی سفر، اس کی تنہائی، بے چارگی اور جہاد کے مختلف پہلوؤں کو ان چند لفظوں نے اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے اور جو بات اس شعر میں بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ عشق خود ہی اپنا مقصود ہے اس میں ہجر و وصل کی کچھ اہمیت نہیں، عاشق کے لیے دونوں مہلک ہو سکتے ہیں۔ اتنے بڑے مفہوم کو جتنی نفاست اور سہولت سے میر نے دو مصرعوں میں بند کر دیا ہے وہ کسی دوسرے شاعر سے ممکن نہیں ہو سکتا۔

دوسرا سیدھا سادا شعر دیکھیے ؎

آگ سی اک دل میں سُلگے ہے، کبھی بھڑکی تو میرؔ
دے گی میری ہڈیوں کا ڈھیر جوں ایندھن جلا

اس شعر میں کوئی غیر معمولی، نامانوس، ثقیل یا پیچیدہ لفظ نہیں ہے۔ جتنے الفاظ ہیں وہ ہمارے روزمرّہ کے مشاہدے میں آنے والے ہیں جن کی پوری معنویت کا ہمیں علم بھی ہے، ادراک بھی،

احساس بھی۔

ان سادہ سے لفظوں میں بھی ایک دوسرے سے گہرا معنوی ربط موجود ہے
آگ ، سلگے ہے ، بھڑکی ، ایندھن ، جلا

ان لفظوں کا معنوی رشتہ ایک دوسرے سے ظاہر ہے۔ "ہڈیوں کے ڈھیر" پر غور کریں تو ایندھن کی ایک خیالی تصویر کے ساتھ انسان کی بے بسی اور خود کہنے والے کی حالتِ زار کا نقشہ سامنے آجاتا ہے یہ تو سب لفظی رعایت اور تصویر کشی کی باتیں ہیں لیکن شعر ان پر مرکوز نہیں ہے۔ کہنا وہی بات چاہتا ہے جو خسرو نے اپنے فارسی شعر میں کہی ہے :

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد
وگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

لیکن خسرو کے شعر میں مبالغہ نے تاثیر کو بڑھانے کی بجائے کم کر دیا ہے۔ وہ دردِ دل کی سوزش اور اس کی شدّت کا بیان کر رہے ہیں کہ اُس کے اظہار سے زبان جل سکتی ہے۔ کسی بیان سے زبان کا جل جانا خلافِ عادت اور خلافِ فطرت ہے۔ اسی طرح اُس کے نہ کہنے سے "مغزِ استخواں" کا سوخت ہو جانا بھی نرا مبالغہ ہے۔ شعر کا مفہوم یہ ہے کہ ایک ایسی کیفیت ہے جس نے سخت عاجز کر رکھا ہے کہ نہ بیان ہو سکتی ہے نہ چھپائی جا سکتی ہے۔

میرؔ نے سادہ اور فطری انداز میں کہا ہے کہ میرے سینے میں اک "آگ سی" لگی ہوئی ہے یہاں "سی" کی اہمیت کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس نے بیان میں مبالغہ پر قابو پالیا ہے۔ اُس کیفیت کو وہ آگ نہیں کہہ رہا ہے آگ سے تشبیہ دے رہا ہے۔ اس کے بعد "سُلگے ہے" میں جو دھیمی دھیمی کیفیت ہے وہ

بھی جذبات نگاری کی غیر معمولی مثال ہے۔ پھر اپنے اندیشے کا اظہار کرتا ہے کہ یہ کیفیت اگر اسی طرح باقی رہی اور " بھڑکنے " کی منزل پر آ گئی تو میرے سارے وجود کو جو ہڈیوں کے ایک ڈھیر سے زیادہ نہیں ہے جلا کر بھسم کر دے گی۔

قصہ کوتاہ۔ میرؔ کے فن نے اردو شاعری میں اُن بلندیوں کو چھو لیا ہے جہاں تک کم شاعروں کی رسائی ہوتی ہے۔ اپنی شخصیت کے سچّے اظہار میں وہ عالمی ادب کے کسی بھی معیار سے پرکھے جا سکتے ہیں اور اس پر پورے اُتریں گے۔

باب سوم

انتخابِ کلامِ میرؔ

(دیوان اوّل)

انتخاب غزلیات

(دیوان اوّل)

ہم خاک میں ملے تو ملے، لیکن اے سپہر — اُس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا

کل پانو ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا — یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا ق

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر — میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُر غرور تھا

آیا تو سہی وہ کوئی دم کے لیے لیکن — ہونٹوں پہ مرے جب نفسِ بازپسیں تھا

شب کوفت سے ہجراں کی جہاں تن پہ رکھا ہاتھ — جو درد و الم تھا سو کہے تو کہ وہیں تھا

نام آج کوئی یاں نہیں لیتا ہے اُنھوں کا — جن لوگوں کے کل ملک یہ سب زیرِ نگیں تھا

مسجد میں امام آج ہوا آ کے وہاں سے
کل تک تو یہی میرؔ خرابات نشیں تھا

جان گھبراتی ہے اندوہ سے تن میں کیا کیا　　تنگ احوال ہے اس یوسفِ زندانی کا
اُس کا منھ دیکھ رہا ہوں سو وہی دیکھوں ہوں　　نقش کا سا ہے سماں میری بھی حیرانی کا

اِس عہد میں الٰہی محبّت کو کیا ہوا　　چھوڑا وفا کو اُن نے مروّت کو کیا ہوا
جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف　　اے کشتۂ ستم تری غیرت کو کیا ہوا

کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات!　　کلی نے یہ سن کر تبسّم کیا
جگر ہی میں یک قطرہ خوں ہے سرشک　　پلک تک گیا تو تلاطم کیا

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا، اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا
عہدِ جوانی رو رو کاٹا، پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے، صبح ہوئی آرام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
سارے رند اوباش جہاں کے تجھ سے سجود میں رہتے ہیں
بانکے ٹیڑھے ترچھے تیکھے سب کا تجھ کو امام کیا

سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اُس کی اُور گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا

کس کا کعبہ کیسا قبلہ کون حرم ہے کیا احرام
کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

یاں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا، یا دن کو جوں توں شام کیا

ساعدِ سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لا کر چھوڑ دیے
بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا

ایسے آہوے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی
سحر کیا اعجاز کیا جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا

میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

جواب نامہ سیاہی کا اپنی ہے وہ زلف
کسو نے حشر کو ہم سے اگر سوال کیا

لگا نہ دل کو کہیں، کیا سنا نہیں تو نے
جو کچھ کہ میرؔ کا اس عاشقی نے حال کیا

منعم نے بِنا ظلم کی رکھ گھر تو بنایا
پر آپ کوئی رات ہی مہمان رہے گا
جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

اب کی جو ترے کوچے سے جاؤں گا تو سینو
پھر جیتے جی اس راہ وہ بدنام نہ آیا

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا
کل اُس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا
آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا
زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اِس آشفتہ سری کا
ہر زخم جگر داورِ محشر سے ہمارا
انصاف طلب ہے تری بیدادگری کا

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو
آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

صد موسم گل ہم کو تہِ بال ہی گذرے
مقدور نہ دیکھا کبھو بے بال و پری کا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

ٹک میرؔ جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسا ہے چراغ سحری کا

منھ تکا ہی کرے ہے جس تس کا — حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہوں — دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

تاب کس کو جو حالِ میرؔ سنے
حال ہی اور کچھ ہے مجلس کا

قامت خمیدہ، رنگ شکستہ، بدن نزار
تیرا تو میرؔ غم میں عجب حال ہو گیا

آباد جس میں تجھ کو دیکھا تھا ایک مدّت

اس دل کی مملکت کو اب ہم خراب دیکھا

لیتے ہی نام اس کا، سوتے سے چونک اُٹھے ہو

ہے خیر میرؔ صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا؟

دل بہم پہنچا بدن میں تب سے سارا تن جلا

آپڑی یہ ایسی چنگاری کہ پیراہن جلا

کب تلک دھونی لگائے جوگیوں کی سی رہوں

بیٹھے بیٹھے در پہ تیرے تو مرا آسن جلا

آگ سی اک دل میں سلگے ہے، کبھی بھڑکی تو میرؔ

دے گی میری ہڈیوں کا ڈھیر جوں ایندھن جلا

جب جنوں سے ہمیں توسّل تھا

اپنی زنجیر پا ہی کا غُل تھا

اب تو دل کو نہ تاب ہے نہ قرار

یاد ایّام جب تحمّل تھا

خوب دریافت جو کیا ہم نے
وقتِ خوش میرؔ، نکہتِ گُل تھا

دل تاب ہی لایا نہ ٹک جو یاد رہتا ہم نشیں
اب عیش روزِ وصل کا ہے جی میں بھولا خواب سا
سنّا ہٹے میں جان کے ہوش وحواس و دم نہ تھا
اسباب سارا لے گیا آیا تھا اک سیلاب سا

احوال خوش انھوں کا، ہم بزم ہیں جو تیرے
افسوس ہے کہ ہم نے واں کا نہ بار پایا
شہرِ دل ایک مدت، اجڑا بسا غموں میں
آخر اجاڑ دینا اس کا قرار پایا
اتنا نہ تجھ سے ملتے نے دل کو کھوکے روتے
جیسا کیا تھا ہم نے ویسا ہی یار پایا
کیا اعتباریاں کا، پھر اس کو خوار دیکھا
جس نے جہاں میں آکر کچھ اعتبار پایا

کم فرصتی جہاں کے مجمع کی کچھ نہ پوچھو
احوال کیا کہوں میں اس مجلسِ رواں کا
یا روئے یا رلایا اپنی تو یوہیں گذری
کیا ذکر ہم صفیراں یارانِ شادماں کا

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا — دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا
مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں — تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

رہ گذر سیلِ حوادث کا ہے بے بنیاد دہر
اس خرابے میں نہ کرنا فکر تم تعمیر کا
کس طرح سے مانیے یارو کہ یہ عاشق نہیں
رنگ اڑا جاتا ہے ٹک دیکھو تو چہرہ میرؔ کا

اُگتے تھے دستِ بلبل و دامانِ گل بہم — صحنِ چمن نمونۂ یوم الحساب تھا

دل نے ہم کو مثالِ آئینہ — ایک عالم کا روشناس کیا
صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی — کیا پتنگے نے التماس کیا

گر کوئی پیر مغاں مجھ کو کرے تو دیکھے پھر
میکدہ سارے کا سارا، صَرف ہے اللہ کا

نامرادی کی رسم میرؔ سے ہے   طور یہ اِس جوان سے نکلا

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر
تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں جی نکل گیا

تڑپ کے مرنے سے دل کے، کہ مغفرت ہو اُسے
جہاں میں کچھ تو رہا نام بے قراروں کا
تڑپ کے خرمن گل پر کبھی گرا اے بجلی
جلانا کیا ہے مرے آشیاں کے خاروں کا

آنکھوں میں جی مرا ہے اِدھر دیکھتا نہیں
مرتا ہوں میں تو۔ ہائے رے صرفہ نگاہ کا
یک قطرہ خون ہو کے پلک سے ٹپک پڑا
قصّہ یہ کچھ ہوا دلِ غفراں پناہ کا

ظالم زمیں سے لوٹتا دامن اٹھا کے چل
ہوگا کمیں میں ہاتھ کسی داد خواہ کا

دل سے شوقِ رخِ نکو نہ گیا
جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا
سب گئے ہوش وصبر وتاب وتواں
لیکن اے داغ دل سے تو نہ گیا
دل میں کتنے مسودے تھے ولے
ایک پیش اس کے روبرو نہ گیا

جن بلاؤں کو میرؔ سنتے تھے
ان کو اس روزگار میں دیکھا

دمِ صبح بزمِ خوشِ جہاں، شبِ غم سے کم نہ تھی مہرباں
کہ چراغ تھا سو تو دود تھا، جو پتنگ تھا سو غبار تھا
دلِ خستہ جو لہو ہوگیا تو بھلا ہوا کہ کہاں تلک
کبھو سوز سینہ سے داغ تھا کبھو درد و غم سے فگار تھا

یہ تمھاری ان دنوں دوستاں، مژہ جس کے غم میں ہے خونچکاں
وہی آفتِ دلِ عاشقاں کسو وقت ہم سے بھی یار تھا
کبھو جائے گی جو ادھر صبا تو یہ کہیو اس سے کہ بے وفا
مگر ایک میرؔ شکستہ پا ترے باغِ تازہ میں خار تھا

دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ
جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا
کنج کاوی جو کی سینے کی غمِ ہجراں نے
اِس دفینے میں سے اقسامِ جواہر نکلا

تمام عمر رہیں خاکِ زیرِ پا اُس کی
جو زور کچھ چلے ہم عجز دستگاہوں کا

پھوڑا سا ساری رات جو پکتا رہے گا دل
تو صبح تک تو ہاتھ لگایا نہ جائے گا
یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ
ناداں پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

میں نہ کہتا تھا کہ منھ کر دل کی اور
اب کہاں وہ آئینہ، ٹوٹا، گیا
دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

اتنی گذری جو ترے ہجر میں سو اس کے سبب
صبر مرحوم عجب مونسِ تنہائی تھا

ٹک گورِ غریباں کی کر سیر کہ دنیا میں
ان ظلم رسیدوں پر کیا کیا نہ ہوا ہوگا
آنکھوں سے تری ہم کو ہے چشم کہ اب ہووے
جو فتنہ کہ دنیا میں برپا نہ ہوا ہوگا

چشم خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا
ہم نے جانا تھا کہ بس اب تو یہ ناسور گیا

یہ توہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا   آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

سخت کافر تھا جن نے پہلے میرؔ
مذہبِ عشق اختیار کیا

شب کو اس کا خیال تھا دل میں   گھر میں مہماں عزیز کوئی تھا

ان صحبتوں میں آخر جانیں ہی جاتیاں ہیں
نے عشق کو ہے صرفہ نے حسن کو محابا

کیا کیا عزیز دوست ملے میرؔ خاک میں
نادان یاں کسو کا کسو کو بھی غم ہوا ؟

اگرچہ عمر کے دس دن یہ لب رہے خاموش
سخن رہے گا سدا میری کم زبانی کا
ہزار جان سے قربان بے پری کے میں
خیال بھی کبھو گذرا نہ پَر فشانی کا

بتاں کے عشق نے بے اختیار کر ڈالا
وہ دل کہ جس کا خدائی میں اختیار رہا
گلی میں اس کی گیا، سو گیا، نہ بولا پھر
میں میرؔ میرؔ کر اس کو بہت پکار رہا

شہرِ دل آہ عجب جائے تھی پر اس کے گئے
ایسا اجڑا کہ کسی طرح بسایا نہ گیا
سر نشینِ رہِ میخانہ ہوں میں کیا جانوں
رسم مسجد کے تئیں شیخ، کہ آیا نہ گیا

چمن میں ہم بھی زنجیری رہے ہیں
سنا ہوگا کبھو شیون ہمارا
کیا تھا ریختہ پردہ سخن کا
سو ٹھہرا ہے یہی اب فن ہمارا

گلیوں میں اب تلک تو مذکور ہے ہمارا
افسانۂ محبت مشہور ہے ہمارا
ہیں مشتِ خاک لیکن، جو کچھ ہیں میرؔ ہم ہیں
مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا

کرو گے یاد باتیں تو کہو گے
کوئی وارفتۂ بسیار گو تھا
جہاں پُر ہے فسانے سے ہمارے
دماغ عشق ہم کو بھی کبھو تھا
نہ دیکھا میرِ آوارہ کو لیکن
غبار اک ناتواں سا کو بکو تھا

راہِ دورِ عشق میں روتا ہے کیا ‏ ‏ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

قافلے میں صبح کے اک شور ہے ‏ ‏ یعنی غافل ہم چلے سوتا ہے کیا

یہ نشانِ عشق ہیں، جاتے نہیں ‏ ‏ داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا

غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز

میرؔ اس کو رایگاں کھوتا ہے کیا

[illegible] میں اک گرہ سی تہ خاک ساتھ ہے ‏ ‏ شاید کہ مر گئے پہ بھی خاطر میں کچھ رہا

شمع ساں جلتے رہے لیکن نہ توڑا یار سے

رشتۂ الفت تمامی عمر گردن میں رہا

رنگ اُڑ چلا چمن میں گلوں کا تو کیا نسیم

ہم کو تو روز گار نے بے بال و پر کیا

وہ دشتِ خوفناک رہا ہے مرا وطن

سن کر جسے خضر نے سفر سے حذر کیا

لکنت تری زبان کی ہے سحر جس سے شوخ

یک حرف نیم گفتہ نے دل پر اثر کیا

کچھ نہ دیکھا پھر بجز یک شعلۂ پُر پیچ و تاب
شمع تک تو ہم نے دیکھا تھا کہ پروا نہ گیا

یک نگہ سے بیش کچھ نقصاں نہ آیا اس کے تئیں
اور میں بے چارہ تو اے مہرباں مارا گیا
وصل و ہجراں یہ جو دو منزل ہیں راہ عشق کی
دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا

ہوش جاتا نہیں رہا لیکن
جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا
صبر تھا ایک مونسِ ہجراں
سو وہ مدّت سے اب نہیں آتا
دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش
گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا
جی میں کیا کیا ہے اپنے اے ہمدم
پر سخن تا بلب نہیں آتا

کیا ہے جو اُٹھ گیا ہے، پر بستۂ وفا ہے
قیدِ حیات میں ہے تو میرؔ آ رہے گا

جگر چاکی، ناکامی، دنیا ہے آخر
نہیں آئے جو میرؔ، کچھ کام ہوگا

رہ طلب میں گرے ہوتے سر کے بھل ہم بھی
شکستہ پائی نے اپنی ہمیں سنبھال لیا

یہ حسرت ہے مروں اُس میں لیے لبریز پیمانہ
مہکتا ہو نپٹ جو پھول سی دارو سے میخانہ
نہ وے زنجیر کے غل ہیں نہ وے جز گے غزالوں کے
مرے دیوان پن تک ہی رہا معمور ویرانہ

قدر رکھتی نہ تھی متاع دل — سارے عالم کو میں دکھا لایا
دل کہ یک قطرہ خوں نہیں ہے بیش — ایک عالم کے سر بلا لایا
سب پہ جس بار نے گرانی کی — اس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا
دل مجھے اس گلی میں لے جا کر — اور بھی خاک مین ملا لایا
ابتدا ہی میں مرگئے سب یار — عشق کی کون انتہا لایا
اب تو جاتے ہیں بتکدے سے میرؔ — پھر ملیں گے اگر خدا لایا

جلوۂ ماہ تہِ ابرِ تنک ، بھول گیا

اُن نے سوتے میں دوپٹے سے جو منھ کو ڈھانکا

اُٹھ گیا ایک ، تو اک مرنے کو آ بیٹھے ہے

قاعدہ ہے یہی مدّت سے ہمارے ہاں کا

دلّی میں آج بھیکھ بھی ملتی نہیں اُنھیں تھا کل تلک دماغ جنھیں تاج و تخت کا

اب جھمکی اس کی تم نے دیکھی کبھو تو یارو برسوں تلک اُسی میں پھر دل سدا رہے گا

بھلا ہو گا کچھ اک احوال اِس سے یا بُرا ہوگا مآل اپنا ترے غم میں خدا جانے کہ کیا ہوگا

معیشت ہم فقیروں کی سی اخوانِ زماں سے کر کوئی گالی بھی دے تو کہہ "بھلا بھائی بھلا ہوگا"

قیامت کرکے اب تعبیر جس کو کرتی ہے خلقت وہ اس کوچے میں اک آشوب سا شاید ہوا ہوگا

شہرۂ عالم اُسے یُمن محبّت نے کیا ورنہ مجنوں ایک خاک افتادۂ ویرانہ تھا

شب فروغ بزم کا باعث ہوا تھا حسن دوست شمع کا جلوہ غبار دیدۂ پروانہ تھا

کن نیندوں اب تو سوتی ہے اے چشم گریہ ناک مژگاں تو کھول ، شہر کو سیلاب لے گیا

کہیے گا اُس سے قصّۂ مجنوں　　یعنی پردے میں غم سنائیے گا

یک چشمکِ پیالہ ہے ساقی بہارِ عمر　　جھپکی لگی کہ دَور یہ آخر ہی ہوچکا

دیر و حرم سے گذرے اب دل ہے گھر ہمارا　　ہے ختم اس آبلے پر سیر و سفر ہمارا
جوں صبح اب کہاں ہے طولِ سخن کی فرصت　　قصّہ ہی کوئی دم کو ہے مختصر ہمارا

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا　　دم کے جانے کا نہایت غم رہا
دل نہ پہنچا گوشۂ داماں تلک　　قطرۂ خوں تھا مژہ پر جم رہا
زلفیں کھولے تو تو ٹک آیا نظر　　عمر بھریاں کامِ دل برہم رہا

مجلسِ آفاق میں پروانہ ساں　　میرؔ بھی شام اپنی سحر کر گیا

یا قافلہ در قافلہ ان رستوں میں تھے لوگ　　یا ایسے گئے یاں سے کہ پھر کھوج نہ پایا

سرسری تم جہاں سے گذرے　　ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا
دل کی کچھ قدر کرتے رہیو تم　　یہ ہمارا بھی ناز پرور تھا

اب خرابہ ہوا جہاں آباد ورنہ ہراک قدم پہ یاں گھر تھا

خوش رہا جب تلک رہا جیتا

میرؔ معلوم ہے قلندر تھا

مشکل بہت ہے ہم سا پھر کوئی ہاتھ آنا یوں مارنا تو پیارے آسان ہے ہمارا

کرتا ہے کام وہ دل جو عقل میں نہ آوے گھر کا مشیر کتنا نادان ہے ہمارا

بنجر زمین دل کی ہے میرؔ مِلک اپنی

پُر داغ سینہ، مُہرِ فرمان ہے ہمارا

آدم خاکی سے عالم کو جِلا ہے ورنہ آئینہ تھا یہ مگر قابلِ دیدار نہ تھا

صدگلستاں تہِ یک بال تھے اس کے جب تک طائرِ جاں قفس تن کا گرفتار نہ تھا

پائے پُرآبلہ سے میں گم شدہ گیا ہوں ہر خار بادیے کا میرا نشان دے گا

حسرت اس کی جگہ تھی خوابیدہ میرؔ کا کھول کر کفن دیکھا

جس صید گاہ عشق میں یاروں کا جی گیا مرگ اس شکار گہ میں شکارِ رمیدہ تھا

کہاں آتے میسر تجھ سے مجھ کو خود نما اتنے ہوا یوں اتفاق آئینہ میرے روبرو ٹوٹا

گر زمزمہ یہی ہے کوئی دن تو ہم صفیر اس فصل ہی میں ہم کو گرفتار دیکھنا

گئی تسبیح اس کی نزع میں کب میرؔ کے دل سے اسی کے نام کی سمرن تھی جب منکا ڈھلکتا تھا

عاشق ہیں ہم تو میرؔ کے بھی ضبط عشق کے دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا

یاں بلبل اور گل پہ تو عبرت سے آنکھ کھول گلگشت سرسری نہیں اس گلستان کا
گل یادگار چہرۂ خوباں ہے بے خبر مرغِ چمن نشاں ہے کسو خوش زبان کا

مغاں مجھ مست بن پھر خندۂ قلقل نہ ہووے گا
مئے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے رووے گا

خدا کو کام تو سونپے ہیں میں نے سب لیکن رہے ہے خوف مجھے واں کی بے نیازی کا

کسو کی بات نے آگے مرے نہ پایا رنگ — دلوں میں نقش ہے میری سخن طرازی کا

آہِ سحر نے سوزشِ دل کو مٹا دیا — اس باؤ نے ہمیں تو دیا سا بجھا دیا
پوشیدہ رازِ عشق چلا جائے تھا جو آج — بے طاقتی نے دل کی وہ پردہ اٹھا دیا
سب شورِ ما و من کو لیے سر میں مر گئے — یاروں کو اس فسانے نے آخر سلا دیا
آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں — مشتِ غبار لے کے صبا نے اڑا دیا
مدت رہے گی یاد ترے چہرے کی جھلک — جلوے کو جس نے ماہ کے دل سے بھلا دیا

رویا کیے ہیں غم سے ترے ہم تمام شب — پڑتی رہی ہے زور سے شبنم تمام شب
شکوہ عبث ہے میر کہ کڑھتے ہیں سارے دن — یا دل کا حال رہتا ہے درہم تمام شب
ق
گذرا کسے جہاں میں خوشی سے تمام روز — کس کی کٹی زمانے میں بے غم تمام شب

کس کی مسجد، کیسے میخانے، کہاں کے شیخ و شاب — ایک گردش میں تری چشم سیہ کی سب خراب
موند رکھنا چشم کا ہستی میں عینِ دید ہے — کچھ نہیں آتا نظر جب آنکھ کھولے ہے حباب
تو ہو اور دنیا ہو ساقی میں ہوں مستی ہو مدام — پر بطِ صہبا نکالے اڑ چلے رنگِ شراب
مت ڈھلک مژگاں سے اب تو اے سرشکِ آبدار — مفت میں جاتی رہے گی تیری موتی کی سی آب
کچھ نہیں، بحرِ جہاں کی موج پر مت بھول میر — دور سے دریا نظر آتا ہے لیکن ہے سراب

اس لیے عشق میں نے چھوڑا تھا؟ | تو بھی کہنے لگا بُرا، کیا خوب !
میرؔ شاعر بھی زور کوئی تھا | دیکھتے ہو نہ بات کا اسلوب

مکھڑے سے اٹھائیں ان نے زلفیں | جانا بھی نہ ہم کدھر گئی رات
تو پاس نہیں ہوا تو روتے | رہ رہ گئی ہے پہر پہر رات

ہر جنس کے خواہاں ملے بازار جہاں میں | لیکن نہ ملا کوئی خریدار محبت
بیکار نہ رہ عشق میں تو رونے سے ہرگز | یہ گریہ ہی ہے آبِ رخِ کارِ محبت
مجھ سا ہی ہو مجنوں بھی یہ کب مانے ہے عاقل | ہر سر نہیں اے میرؔ سزاوار محبت

دل خراشی و جگر چاکی و خوں آشامی | ہوں تو ناکام پہ رہتے ہیں مجھے کام بہت
پھر نہ آئے جو ہوئے خاک میں جا آسودہ | غالباً زیر زمیں میرؔ ہے آرام بہت

نکتہ دانانِ رفتہ کی نہ کہو | بات وہ ہے جو ہووے اب کی بات
ظلم ہے، قہر ہے، قیامت ہے | غصّے میں اس کے زیر لب کی بات
کہتے ہیں آگے تھا بتوں میں رحم | ہے خدا جانیے یہ کب کی بات

واشُد ہوئی نہ دل کو فقیروں کے بھی ملے　　　کھلتی نہیں گرہ یہ کسو کی دعا سے آج
ساقی ٹک ایک موسم گل کی طرف بھی دیکھ　　　ٹپکا پڑے ہے رنگ چمن میں ہوا سے آج

چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر　　　منھ نظر آتا ہے دیواروں کے بیچ

حال گلزار زمانہ کا ہے جیسے کہ شفق　　　رنگ کچھ اور ہی ہو جائے ہے اک آن کے بیچ
تاک کی چھانو میں جوں مست پڑے سوتے ہوں　　　اُنڑتی ہیں نگہیں سایۂ مژگان کے بیچ

زندگی کس کے بھروسے پہ محبت میں کروں　　　اک دل غم زدہ ہے سو بھی ہے آفات کے بیچ
بے مئے و مغبچہ اک دم نہ رہا تھا کہ رہا　　　اب تلک میرؔ کا تکیہ ہے خرابات کے بیچ

نالے میں اپنے پنہاں میں بھی ہوں ساتھ تیرے　　　شاہد ہے گرد محمل، شورِ درا ہے شاہد

ہم امید وفا پہ تیری ہوئے　　　غنچۂ دیر چیدہ کے مانند
سر اٹھاتے ہی ہو گئے پامال　　　سبزۂ نو دمیدہ کے مانند
ہم گرفتار حال ہیں اپنے　　　طائر پر بُریدہ کے مانند

میرے سنگ مزار پر فرہاد — رکھ کے تیشہ کہے ہے یا استاد
خاک بھی سر پہ ڈالنے کو نہیں — کس خرابے میں ہم ہوئے آباد
خوب ہے خاک سے بزرگوں کی — چاہنا تو مرے تئیں امداد
پر مروّت کہاں کی ہے اے میرؔ — ق — تو ہی مجھ دل جلے کو کر ارشاد
نامرادی ہو جس پہ پروانہ
وہ جلاتا پھرے چراغِ مراد

گل پژ مردہ کا نہیں ممنون — ہم اسیروں کا گوشۂ دستار
سیکڑوں حرف ہیں گرہ دل میں — پر کہاں پائیے لب اظہار
میرؔ صاحب زمانہ نازک ہے — دونوں ہاتھوں سے تھامیے دستار

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے — پچھتاؤگے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کر

جاتا ہے آسماں لیے کوچے سے یار کے — آتا ہے جی بھرا در و دیوار دیکھ کر
جی میں تھا اس سے ملیے تو کیا کیا نہ کہیے میرؔ — پر جب ملے تو رہ گئے ناچار دیکھ کر

نہ ملیں گو کہ ہجر میں مرجائیں — عاشقوں کا وصال ہے کچھ اور

اوّلِ کارِ محبت تو بہت سہل ہے میر جی سے جاتا ہے ولے صبر و قرار آخر کار

دل سے میرے شکستیں الجھی ہیں سنگ باراں ہے آبگینے پر
چاک سینے سے کھل گئے ٹانکے کیا رفو کم ہوا ہے سینے پر

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے چلیں گے دم لے کر
دل پہ کب اکتفا کرے ہے عشق جائے گا جان بھی یہ غم لے کر

یاں جہاں میں کہ شہرِ کوراں ہے سات پردے ہیں چشم بینا پر
فرصت عیش اپنی یوں گذری کہ مصیبت پڑی تمنّا پر

میر کیا بات اس کے ہونٹوں کی
جینا دوبھر ہوا مسیحا پر

وے لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیے پیدا کیے تھے چرخ نے جو خاک چھان کر
ہم وہ ہیں جن کے خوں سے تری راہ سب ہے گل مت کر خراب ہم کو تو اوروں میں سان کر

حاصل بجز کدورت اس خاکداں میں کیا ہے خوش وہ کہ اٹھ گئے ہیں داماں جھٹک جھٹک کر

عمر گذری دوائیں کرتے میرؔ   درد دل کا ہوا نہ چارہ ہنوز

اشک کی لغزشِ مستانہ پہ مت کیجیو نظر   دامنِ دیدۂ گریاں ہے مرا پاک ہنوز

آرہا ہے جی مرا آنکھوں میں اک پل اور ہوں
پر نہیں جاتا کسی کے دیکھنے کا غم ہنوز

حرماں تو دیکھ، پھول بکھیرے تھی کل صبا   اک برگ گل گرا نہ جہاں تھا مرا قفس

کیونکے نکلا جائے بحرِ غم سے مجھ بیدل کے پاس
آکے ڈوبی جاتی ہے کشتی مری ساحل کے پاس

مرگیا میں، ملا نہ یار افسوس   آہ افسوس، صد ہزار افسوس
یوں گنواتا ہے دل کوئی مجھ کو   یہی آتا ہے بار بار افسوس
رخصتِ سیر باغ تک نہ ہوئی   یوہیں جاتی رہی بہار افسوس

جمشید جس نے وضع کیا جام کیا ہوا   وے صحبتیں کہاں گئیں کیدھر وہ ناؤ نوش

جز لالہ اس کے جام سے پاتے نہیں نشاں ہے کوکنار اس کی جگہ اب سبو بدوش
جھومے ہے بید جاے جوانانِ میگسار بالاے خم ہے خشتِ سرِ دبیرِ میفروش

محبّت نے شاید کہ دی دل کو آگ دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف
بہت رنگ ملتا ہے، دیکھو کبھو ہماری طرف سے سحر کی طرف

مانندِ طیرِ نوپر، اٹھے جہاں گئے ہم دشوار ہے ہمارا آنا پھر آشیاں تک

مدت ہوئی گھٹ گھٹ کے ہمیں شہر میں مرتے واقف نہ ہوا کوئی اس اسرار سے اب تک
دیکھا تھا کہیں سایہ ترے قد کا چمن میں ہیں میر جی آوارہ پری دار سے اب تک

کچھ ہواے مرغِ چمن لطف نہ جاوے اس سے نوحہ یا نالہ ہر اک بات کا انداز ہے ایک
ناتوانی سے نہیں بال فشانی کا دماغ ورنہ تا باغ قفس سے مری پرواز ہے ایک
گوش کو ہوش کے ٹک کھول کے سن شورِ جہاں سب کی آواز کے پردے میں سخن ساز ہے ایک
چاہے جس شکل سے تمثال صفت اس میں در آ عالم آئینے کے مانند درباز ہے ایک

دور اب بیٹھتے ہیں مجلس میں ہم جو تم سے تھے بیشتر نزدیک

دور پھرنے کا ہم سے وقت گیا		پوچھ کچھ حال بیٹھ کر نزدیک
مر بھی رہ میرؔ شب بہت رویا		ہے مری جان اب سحر نزدیک

بجھ گئے ہم چراغ سے باہر		کہیو اے باد، شمع محفل تک
نہ گیا میرؔ اپنی کشتی سے		ایک بھی تختہ پارہ ساحل تک

بن جو کچھ بن سکے جوانی میں		رات تو تھوڑی ہے بہت ہے سانگ
میرؔ بندوں سے کام کب نکلا		مانگنا ہے جو کچھ خدا سے مانگ

آئی بہار و گلشن گل سے بھرا ہے لیکن		ہر گوشہ چمن میں خالی ہے جاے بلبل

مشکل ہے مٹ گئے ہوئے نقشوں کی پھر نمود
جو صورتیں بگڑ گئیں ان کا نہ کر خیال

کس کو دماغ شعر و سخن ضعف میں کہ میرؔ
اپنا رہے ہے اب تو ہمیں بیشتر خیال

کیوں نہ دیکھوں چمن کو حسرت سے　　آشیاں تھا مرا بھی یاں پر سال

آج آوارہ ہو اے بال اسیران قفس　　یہ گل و باغ و خیابان نہ ہوویں گے کل

وعدۂ وصل رہا ہے شب آیندہ پہ میرؔ

بخت خوابیدہ جو ٹک جاگتے سوویں گے کل

اس جستجو میں اور خرابی تو کیا کہیں　　اتنی نہیں ہوئی ہے صبا در بدر کہ ہم

اس بزم خوش کے محرم ناآشنا ہیں سارے　　کس کو کہوں کہ واں تک میری خبر کرو تم

ہے پیچ دار ازبس راہ وصال ہجراں　　ان دو ہی منزلوں میں برسوں سفر کرو تم

جاؤ نہ دل سے، منظرِ تن میں ہے جا یہی　　پچھتاؤ گے اٹھو گے اگر اس مکاں سے تم

جتنے تھے کل تم آج نہیں پاتے اتنا ہم　　ہر دم چلے ہی جاتے ہو آب رواں سے تم

نہ پھر رکھیں گے تیری رہ میں پا ہم　　گئے گذرے ہیں آخر ایسے کیا ہم

مرض ہی عشق کا بے ڈول ہے کچھ　　بہت کرتے ہیں اپنی سی دوا ہم

کہیں پیوند ہوں یارب زمیں کے　　پھریں گے اس سے یوں کب تک جدا ہم

کب آگے کوئی مرتا تھا کسی پر جہاں میں کر گئے رسم وفا ہم
تعارف کیا رہا اہل چمن سے ہوئے اک عمر کے پیچھے رہا ہم
موا جس کے لیے اس کو نہ دیکھا
نہ سمجھے میرؔ کا کچھ مدّعا ہم

گرچہ آوارہ جوں صبا ہیں ہم لیک لگ چلنے میں بلا ہیں ہم
اے بتاں اس قدر جفا ہم پر عاقبت بندۂ خدا ہیں ہم
کوئی خواہاں نہیں ہمارا میرؔ
گوئیا جنس ناروا ہیں ہم

گیا جہان سے خورشید ساں اگرچہ میرؔ
ولیک مجلس دنیا میں اس کی جا ہے گرم

کرتے ہیں گفتگو سحر اٹھ کر صبا سے ہم لڑنے لگے ہیں ہجر میں اس کے ہوا سے ہم

بے کلی بے خودی کچھ آج نہیں ایک مدت سے وہ مزاج نہیں
درد اگر یہ ہے تو مجھے بس ہے اب دوا کی کچھ احتیاج نہیں

ہم نے اپنی سی کی بہت لیکن　　مرض عشق کا علاج نہیں

شہر خوبی کو خوب دیکھا میرؔ
جنس دل کا کہیں رواج نہیں

از خویش رفتہ ہر دم فکر وصال میں ہوں　　کتنا میں کھویا جاؤں یارب کہ تجھ کو پاؤں
آسودگی تو معلوم اے میرؔ جیتے جی یاں　　آرام تب ہی پاؤں جب جی سے ہاتھ اٹھاؤں

اس طرح دل گیا کہ اب تک ہم　　بیٹھے روتے ہیں ہاتھ ملتے ہیں
بھری آتی ہیں آج یوں آنکھیں　　جیسے دریا کہیں اُبلتے ہیں
دم آخر ہے، بیٹھ جا، مت جا　　صبر کر ٹک، کہ ہم بھی چلتے ہیں
تیرے بے خود جو ہیں سو کیا جیتیں　　ایسے ڈوبے کہیں اچھلتے ہیں
فتنہ در سر، بتانِ حشر خرام　　ہائے رے کس ٹھسک سے چلتے ہیں

میرؔ صاحب کو دیکھیے جو بنے
اب بہت گھر سے کم نکلتے ہیں

دیں عمر خضر موسم پیری میں تو نہ لے　　مرنا ہی اس سے خوب ہے عہد شباب میں

آوازہ ہی جہاں میں ہمارا سنا کرو — عنقا کے طور زیست ہے اپنی بنام یاں
ناکام رہنے ہی کا تمھیں غم ہے آج میرؔ — بہتوں کے کام ہوگئے ہیں کل تمام یاں

نہ گیا خیال زلفِ سیہِ جفا شعاراں — نہ ہوا کہ صبح ہووے شب تیرہ روزگاراں
ہوئی عید سب نے پہنے طرب و خوشی کے جامے — نہ ہوا کہ ہم بھی بدلیں یہ لباس سوگواراں
تو جہاں سے دل اٹھایاں نہیں رسم دردمندی — کسی نے بھی یوں نہ پوچھا ہوئے خاک یاں ہزاراں

یہ سنا تھا میرؔ ہم نے کہ فسانہ خواب زا ہے
تری سرگذشت سن کر گئے اور خواب یاراں

مسل روتے ہی رہیے تو بجھے آتش دل — ایک دو اشک تو اور آگ لگا جاتے ہیں
وقت خوش ان کا جو ہم بزم ہیں تیرے، ہم تو — در و دیوار کو احوال سنا جاتے ہیں
جائے گی طاقت پا آہ تو کیا کریے گا — اب تو ہم حال کبھو تم کو دکھا جاتے ہیں
ایک بیمار جدائی ہوں میں آپھی تس پر — پوچھنے والے جدا جان کو کھا جاتے ہیں

کہیو قاصد جو وہ پوچھے ہمیں کیا کرتے ہیں — جان و ایمان و محبت کو دعا کرتے ہیں
اس کے کوچے میں نہ کر شور قیامت کا ذکر — شیخ یاں ایسے تو ہنگامے ہوا کرتے ہیں
رخصت جنبش لب عشق کی حیرت سے نہیں — مدتیں گذریں کہ ہم چپ ہی رہا کرتے ہیں

تو پری شیشے سے نازک ہے نہ کر دعوی مہر — چھاتی پتھر ہے انھوں کی جو وفا کرتے ہیں
فرصت خواب نہیں ذکر بتاں میں ہم کو — رات دن رام کہانی سی کہا کرتے ہیں
یہ زمانہ نہیں ایسا کہ کوئی زیست کرے — چاہتے ہیں جو برا اپنا بھلا کرتے ہیں
تجھ بن اس جان مصیبت زدہ غم دیدہ پہ ہم — کچھ نہیں کرتے تو افسوس کیا کرتے ہیں

کیا کہیں میر جی ہم تم سے معاش اپنی غرض
غم کو کھایا کریں ہیں لوہو پیا کرتے ہیں

ہم چشم ہے ہر آبلۂ پا کا مرا اشک — از بس کہ تری راہ میں آنکھوں سے چلا ہوں
گو طاقت و آرام و خور و خواب گئے سب — بارے یہ غنیمت ہے کہ جیتا تو رہا ہوں
تب گرم سخن کہنے لگا ہوں میں کہ اک عمر — جوں شمع، سر شام سے تا صبح جلا ہوں

سینہ تو کیا فضل الٰہی سے سبھی چاک
ہے وقت دعا میرؔ کہ اب دل کو لگا ہوں

اس میکدے میں ہم بھی مدت سے ہیں ولیکن
خمیازہ کھینچتے ہیں ہر دم جماہتے ہیں
ناموس دوستی سے گردن بندھی ہے اپنی
جیتے ہیں جب تلک ہم تب تک نباہتے ہیں

سہل اس قدر نہیں ہے مشکل پسندی میری
جو تجھ کو دیکھتے ہیں مجھ کو سراہتے ہیں
وے دن گئے کہ راتیں نالوں سے کاٹتے تھے
بے ڈول میر صاحب اب کچھ کراہتے ہیں

ہوائے میکدہ یہ ہے تو فوتِ وقت ہے ظلم نماز چھوڑ دیں اب کوئی دن گناہ کریں
اگرچہ سہل ہیں پر دیدنی ہیں ہم بھی میرؔ ادھر کو یار تامّل سے گر نگاہ کریں

راضی ہوں گو کہ بعد از صد سال و ماہ دیکھوں
اکثر نہیں تو تجھ کو میں گاہ گاہ دیکھوں
جی انتظار کش ہے آنکھوں میں رہ گذر پر
آجا نظر کہ کب تک میں تیری راہ دیکھوں
یہ دل وہ جا ہے جس میں دیکھا تھا تجھ کو بستے
کن آنکھوں سے اب اجڑا اس گھر کو آہ دیکھوں
چشم و دل و جگر یہ سارے ہوئے پریشاں
کس کس کی تیرے غم میں حالت تباہ دیکھوں

آنکھیں تو تو نے دی ہیں اے جرم بخش عالم
کیا تیری رحمت آگے اپنے گناہ دیکھوں

اب کس کس اپنی خواہش مردہ کو روئیے
تھیں ہم کو اس سے سیکڑوں امیدواریاں
پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں
گل نے ہزار رنگ سخن سر کیا ولے
دل، سے گئیں نہ باتیں تری پیاری پیاریاں
بچ جاتا ایک رات جو کٹ جاتی اور میرؔ
کاٹیں تھیں کوہ کن نے بہت راتیں بھاریاں

آسودہ کیونکہ ہوں میں کہ مانند گرد باد
آوارگی تمام ہے میری سرشت میں

درد و اندوہ میں ٹھہرا جو رہا میں ہی ہوں
رنگِ رو جس کے کبھی منہ نہ چڑھا میں ہی ہوں

لطف آنے کا ہے کیا، بس نہیں اب تاب جفا
اتنا عالم ہے بھرا جاؤ نہ کیا میں ہی ہوں
کاسۂ سر کو لیے مانگتا دیدار پھرے
میرؔ وہ جان سے بیزار گدا میں ہی ہوں

غم کھینچنے کو کچھ تو توانائی چاہیے
سویاں نہ دل میں تاب نہ طاقت ہے جان میں
غافل نہ رہیو ہم سے کہ ہم وے نہیں رہے
ہوتا ہے اب تو حال عجب ایک آن میں
وے دن گئے کہ آتش غم دل میں تھی نہاں
سوزش رہے ہے اب تو ہر اک استخوان میں
دل نذر و دیدہ پیشکش اے باعث حیات
سچ کہہ کہ دل لگے ہے ترا کس مکان میں
پھاڑا ہزار جا سے گریبان صبر میرؔ
کیا کہہ گئی نسیم سحر گل کے کان میں

زباں رکھ غنچہ ساں اپنے دہن میں
بندھی مٹھی چلا جا اس چمن میں
رکھا کر ہاتھ دل پر آہ کرتے
نہیں رہتا چراغ ایسی پون میں
نہ تجھ بن ہوش میں ہم آئے ساقی
مسافر ہی رہے اکثر وطن میں
خرد مندی ہوئی زنجیر ورنہ
گذرتی خوب تھی دیوانہ پن میں
گداز عشق میں بہہ بھی گیا میرؔ
یہی دھوکا سا ہے اب پیرہن میں

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں — تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں
کریے تو گلہ کس سے جیسی تھی ہمیں خواہش — اب ویسے ہی یہ اپنے ارمان نکلتے ہیں
سو کاہے کو، اپنی تو جوگی کی سی پھیری ہے — برسوں میں کبھو ایدھر ہم آن نکلتے ہیں

کوئی نہیں جہاں میں جو اندوہگیں نہیں — اس غم کدے میں آہ دلِ خوش کہیں نہیں

مرنے سے تم ہمارے خاطر نچنت رکھیو — اس کام کا بھی ہم کچھ اسلوب کر چکے ہیں
ہنگامہ قیامت تازہ نہیں جو ہوگا — ہم اس طرح کے کتنے آشوب کر چکے ہیں

دیکھی ہو جس نے صورت دلکش وہ ایک آن — پھر صبر اس سے ہو سکے امکان ہی نہیں
کیا تجھ کو بھی جنوں تھا کہ جامے میں تیرے میرؔ — سب کچھ بچا ہے ایک گریبان ہی نہیں

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں — اپنے سوائے کس کو موجود جانتے ہیں
عجز و نیاز اپنا اپنی طرف ہے سارا — اِس مشتِ خاک کو ہم مسجود جانتے ہیں
صورت پذیر ہم بن ہرگز نہیں دے معنی — اہلِ نظر ہمیں کو معبود جانتے ہیں
عشق ان کی عقل کو ہے جو ماسوا ہمارے — ناچیز جانتے ہیں نابود جانتے ہیں
اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے — اس رمز کو ولیکن معدود جانتے ہیں

یارب کسے ہے نامہ ہر غنچہ اس چمن کا — راہ وفا کو ہم تو مسدود جانتے ہیں
مر کر بھی ہاتھ آوے تو میرؔ مفت ہے وہ — جی کے زیان کو بھی ہم سود جانتے ہیں

چاہے ہے آج ہوں میں ہفت آسماں کے اوپر — دل کے مزاج میں بھی کتنی شتابیاں ہیں

چلا نہ اُٹھ کے وہیں چپکے چپکے پھر تو میرؔ — ابھی تو اس کی گلی سے پکار لایا ہوں

شہاں کہ کحلِ جواہر تھی خاک پا جن کی — انھیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

ہفت اقلیم ہر گلی ہے کہیں — دلّی سے بھی دیار ہوتے ہیں

گفتگو ناقصوں سے ہے ورنہ — میرؔ جی بھی کمال رکھتے ہیں

جنوں تیری منّت ہے مجھ پر کہ تو نے — نہ رکھا مرے سر پہ بار گریباں
کہیں جائیے یہ دَورِ دامن بھی جلدی — کہ آخر ہوا روزگارِ گریباں

بارہا وعدوں کی راتیں آئیاں — طالعوں نے صبح کر دکھلائیاں

ایک چشمک بھی نہ اُس مہ کی سی کی — آنکھیں تاروں نے بہت جھپکائیاں
ایک نے صورت نہ پکڑی پیشِ یار — دل نے شکلیں سینکڑوں ٹھہرائیاں
شوق قامت میں ترے اے نونہال — گل کی شاخیں لیتی ہیں انگڑائیاں

میں کون ہوں اے ہم نفساں سوختہ جاں ہوں — اک آگ مرے دل میں ہے جو شعلہ فشاں ہوں
لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر — میں ورنہ وہی خلوتیِ رازِ نہاں ہوں
جلوہ ہے مجھی سے لب دریاے سخن پر — صد رنگ مری موج ہے میں طبعِ رواں ہوں
پنجہ ہے مرا پنجۂ خورشید میں ہر صبح — میں شانہ صفت سایہ رَوِ زلف بتاں ہوں
دیکھا ہے مجھے جن نے سو دیوانہ ہے میرا — میں باعث آشفتگی طبع جہاں ہوں
تکلیف نہ کر آہ مجھے جنبش لب کی — میں صد سخن آغشتہ بخوں زیر زباں ہوں
ہوں زرد غم تازہ نہالانِ چمن سے — اس باغ خزاں دیدہ میں میں برگ خزاں ہوں
رکھتی ہے مجھے خواہش دل بسکہ پریشاں — در پے نہ ہو اس وقت خدا جانے کہاں ہوں
اک وہم نہیں بیش مری ہستی موہوم — اس پر بھی تری خاطر نازک پہ گراں ہوں

خوش باشی و تنزیہ و تقدس تھے مجھے میرؔ
اسباب پڑے یوں کہ کئی روز سے یاں ہوں

جو بے اختیاری یہی ہے تو قاصد — ہمیں آکے اس کے قدم دیکھتے ہیں

وفا پیشگی قیس تک تھی بھی کچھ کچھ　　اب اس طور کے لوگ کم دیکھتے ہیں

مثال سایہ محبت میں جال اپنا ہوں　　تمھارے ساتھ گرفتار حال اپنا ہوں
اگرچہ نشہ ہوں سب میں خم جہاں میں لیک　　برنگِ مے عرق انفعال اپنا ہوں
مری نمود نے مجھ کو کیا برابر خاک　　میں نقش پا کی طرح پایمال اپنا ہوں
بلا ہوئی ہے مری گو کہ طبع روشن میر
ہوں آفتاب ولیکن زوال اپنا ہوں

کھودیں ہیں نیند میری مصیبت بیانیاں　　تم بھی تو ایک رات سنو یہ کہانیاں
یہ بے قراریاں نہ کبھو اُن نے دیکھیاں　　جاں کاہیاں ہماری بہت سہل جانیاں
مارا مجھے بھی سان کے غیروں میں اُن نے میر
کیا خاک میں ملائیں مری جاں فشانیاں

ایک دم پر ہے بنا تیری سو آیا کہ نہیں　　وہ کچھ اس زندگی میں کر کہ تجھے یاد کریں
کعبہ ہوتا ہے دوانوں کا مری گور سے دشت　　مجھ سے دو اور گڑیں یاں تو سب آباد کریں

شکوہ کروں ہوں بخت کا اتنے غضب نہ ہو بتاں
مجھ کو خدا نخواستہ تم سے تو کچھ گلہ نہیں
ایک فقط ہے سادگی تس پہ بلائے جاں ہے تو
عشوہ کرشمہ کچھ نہیں، ناز نہیں، ادا نہیں
ناز بتاں اُٹھا چکا دیر کو میرؔ ترک کر
کعبے میں جاکے رہ میاں تیرے مگر خدا نہیں؟

خوبرو سب کی جان ہوتے ہیں	آرزوے جہان ہوتے ہیں
گوشِ دیوار تک تو جا نالے	اس میں گل کو بھی کان ہوتے ہیں
کبھو آتے ہیں آپ میں تجھ بن	گھر میں ہم میہمان ہوتے ہیں
غمزۂ چشمِ خوش قدانِ زمین	فتنۂ آسمان ہوتے ہیں

جنوں میرے کی باتیں دشت اور گلشن میں جب چلیاں
نہ چوب گل نے دم مارا نہ چھڑیاں بید کی ہلیاں
دوانہ ہوگیا تو میرؔ آخر ریختہ کہہ کہہ
نہ کہتا تھا میں اے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں

ایسے محروم گئے ہم تو گرفتار چمن | کہ موئے قید میں دیوار بدیوار چمن
وے گنہ گار ہیں ہیں کہ جنھیں کہتے ہیں | عاشق زار چمن مرغ گرفتار چمن

بزم میں جو ترا ظہور نہیں | شمع روشن کے منھ پہ نور نہیں
کتنی باتیں بنا کے لاؤں لیک | یاد رہتی ترے حضور نہیں
فکر مت کر ہمارے جینے کا | ق تیرے نزدیک کچھ یہ دور نہیں
پھر جئیں گے جو تجھ سا ہے جاں بخش | ایسا جینا ہمیں ضرور نہیں

عام ہے یار کی تجلّی میرؔ
خاصِ موسیٰ و کوہ طور نہیں

ہر نقش پا ہے شوخ ترا رشک یاسمن | کم گوشہ چمن سے ترا رہ گذر نہیں
آتا ہی تیرے کوچے میں ہوتا جو میرؔ یاں | کیا جانیے کدھر کو گیا کچھ خبر نہیں

سمجھ کر ذکر کر آسودگی کا مجھ سے اے ناصح
وہ میں ہی ہوں کہ جس کو عافیت بیزار کہتے ہیں
عجب ہوتے ہیں شاعر بھی، میں اس فرقے کا عاشق ہوں
کہ بے دھڑکے بھری مجلس میں یہ اسرار کہتے ہیں

شیخ عزلت تو تہ خاک بھی پہنچے گی بہم
مفت ہے سیر کہ یہ عالم ایجاد نہیں
کیا کہوں میرؔ فراموش کیا اُن نے تجھے
میں تو تقریب بھی کی، پر تو اُسے یاد نہیں

آجائیں ہم نظر جو کوئی دم بہت ہے یاں
مہلت ہمیں بسانِ شرر کم بہت ہے یاں

یک لحظہ سینہ کوبی سے فرصت ہمیں نہیں
یعنی کہ دل کے جانے کا ماتم بہت ہے یاں

حاصل ہے کیا سوائے ترائی کے دہر میں
اٹھ آسماں تلے سے کہ شبنم بہت ہے یاں

ہم رہ روانِ راہِ فنا دیر رہ چکے
وقفہ بسانِ صبح کوئی دم بہت ہے یاں

اس بت کدے میں معنی کا کس سے کریں سوال
آدم نہیں ہے صورتِ آدم بہت ہے یاں

عالم میں لوگ ملنے کی گوں اب نہیں رہے
ہر چند ایسا ویسا تو عالم بہت ہے یاں

اعجازِ عیسوی سے نہیں بحث عشق میں
تیری ہی بات جانِ مجسّم بہت ہے یاں

گئی عمر میری ساری جیسے شمع باؤ کے بیچ
یہی رونا جلنا گھلنا یہی اضطراب تجھ بن

سنا ہے سے باغ سے کچھ اٹھتے ہیں نسیم
مرغِ چمن نے خوب متھا ہے فغاں کے تئیں

دن نہیں رات نہیں صبح نہیں شام نہیں وقت ملنے کا مگر داخلِ ایّام نہیں

ہے امر سہل چاہت لیکن نباہ مشکل پتھر کرے جگر کو تب تو کرے وفائیں

آرزوئیں ہزار رکھتے ہیں تو بھی ہم دل کو مار رکھتے ہیں
نہ نگہ نے پیام نے وعدہ نام کو ہم بھی یار رکھتے ہیں

خدا جانے کہ دنیا میں ملیں اس سے کہ عقبیٰ میں مکاں تو میرؔ صاحب شہرۂ عالم ہیں یہ دونوں

تن کے معمورے میں یہی دل و چشم گھر تھے دو، سو خراب ہیں دونوں
ایک سب آگ ایک سب پانی دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں
آگے دریا تھے دیدۂ ترِ میرؔ اب جو دیکھو سراب ہیں دونوں

گئے ناواقف شادی اگر ہم بزم عشرت میں دہانِ زخم دل سمجھے جو دیکھا روے خنداں کو
کوئی کانٹا سر رہ کا ہماری خاک پر بس ہے گل گلزار کیا درکار ہے گور غریباں کو
کیا سیر اس خرابے کا بہت اب چل کے سو رہیے کسو دیوار کے سائے میں منھ پر لے کے داماں کو

کیا جانیے اے گوہر مقصد تو کہاں ہے　　ہم خاک میں بھی مل گئے لیکن نہ ملا تو

جاویں نثار ہونے کو ہم کس بساط پر　　اک نیم جاں رکھیں ہیں سو وہ جب قبول ہو
ناکام اس لیے ہو کہ چاہو ہو سب کچھ آج　　تم بھی تو میر صاحب و قبلہ عجول ہو

آہ کس ڈھب سے روئیے کم کم　　شوق حد سے زیاد ہے ہم کو
سادگی دیکھ عشق میں اس کے　　خواہشِ جانِ شاد ہے ہم کو
نامرادانہ زیست کرتا تھا
میر کا طور یاد ہے ہم کو

ہزار مرتبہ بہتر ہے بادشاہی سے　　اگر نصیب ترے کوچے کی گدائی ہو
کہیں تو ہیں کہ عبث میر نے دیا جی کو　　خدا ہی جانے کہ کیا اس کے جی میں آئی ہو

میرے ہلاک کرنے کا غم ہے عبث تمھیں　　تم شاد زندگانی کرو غم بہت ہے یاں
شاید کہ کام صبح تک اپنا کھنچے نہ میر
احوال آج شام سے درہم بہت ہے یاں

بے کسانِ عشق اس کے آہ کس کے پاس جائیں　　گو رہن کوئی صلا میں لب کو وا کرتا نہیں
چھوٹنا ممکن نہیں اپنا قفس کی قید سے　　مرغ سیر آہنگ کو کوئی رہا کرتا نہیں

لیتے ہیں سانس یوں ہم جوں تار کھینچتے ہیں　　اب دل گرفتگی سے آزار کھینچتے ہیں
منصور کی حقیقت تم نے سنی ہی ہو گی　　حق جو کہے ہے اس کو یاں دار کھینچتے ہیں

کرنا لہ کشی کب تئیں اوقات گذاریں　　فریاد کریں کس سے کہاں جا کے پکاریں
جس جا کہ خس و خار کے اب ڈھیر لگے ہیں　　یاں ہم نے انھیں آنکھوں سے دیکھی ہیں بہاریں
بالیں پہ سر اک عمر سے ہے دست طلب کا　　جو ہے سو گدا، کس کنے جا ہاتھ پساریں

یوں ہی حیران و خفا جوں غنچہ تصویر ہوں　　عمر گذری پر نہ جانا میں کہ کیوں دلگیر ہوں

کہے ہے کوہ کن، کر فکر میری خستہ حالی میں　　الٰہی شکر کرتا ہوں تری درگاہِ عالی میں
خلاف ان اور خوباں کے سدا یہ جی میں رہتا ہے　　یہی تو میر اک خوبی ہے معشوق خیالی میں

جہاں اب خارزاریں ہو گئی ہیں　　یہاں آگے بہاریں ہو گئی ہیں

خوش نہ آئی تمھاری چال ہمیں — یوں نہ کرنا تھا پایمال ہمیں
صرف للہ خم کے خم کرتے — نہ کیا چرخ نے کلال ہمیں
کب تک اس تنگنا میں کھینچیے رنج — یاں سے یارب توہی نکال ہمیں

وجہ کیا ہے کہ میرؔ منھ پہ ترے
نظر آتا ہے کچھ ملال ہمیں

نہ کیونکہ شیخ توکّل کو اختیار کریں — زمانہ ہووے مساعد تو روزگار کریں
تمام صید سر تیر جمع ہیں لیکن — نصیب اس کے کہ جس کو ترا شکار کریں
ہمیں تو نزع میں شرمندہ آکے ان نے کیا — رہا ہے ایک رمق جی سو کیا نثار کریں

اے چرخ مت حریف اندوہ بے کساں ہو — کیا جانے منھ سے نکلے نالے کے کیا سماں ہو
تا چند کوچہ گردی جیسے صبا زمیں پر — اے آہ صبح گاہی، آشوبِ آسماں ہو
گر ذوق سیر ہے تو آوارہ اس چمن میں — مانند عندلیب گم کردہ آشیاں ہو
از خویش رفتہ ہر دم رہتے ہیں ہم جو اس بن — کہتے ہیں لوگ اکثر، اس وقت تم کہاں ہو
ہم سایہ اس چمن کے کتنے شکستہ دم ہیں — اتنے پیے کہ شاید اک بادِ گلفشاں ہو

گرچہ کب دیکھتے ہو پر دیکھو — آرزو ہے کہ تم ادھر دیکھو

عشق کیا کیا ہمیں دکھاتا ہے　　آہ تم بھی تو اک نظر دیکھو
یوں عرق جلوہ گر ہے اس منھ پر　　جس طرح اوس پھول پر دیکھو

لطف مجھ میں بھی ہیں ہزاروں میرؔ
دیدنی ہوں جو سوچ کر دیکھو

اے وہ کوئی جو آج پیے ہے شراب عیش　　خاطر میں رکھیو کل کے بھی رنج و خمار کو
جیتے جی فکر خوب ہے ورنہ یہ بد بلا　　رکھے گا حشر تک تہ و بالا مزار کو
گر ساتھ لے گڑا تو دل مضطرب تو میرؔ　　ق　آرام ہو چکا ترے مشت غبار کو

عالم ہے شوق کشتہ، خلقت ہے تیری رفتہ　　جانوں کی آرزو تو، آنکھوں کا مدعا تو
کم میری اور آنا، کم آنکھ کا ملانا　　کرنے سے یہ ادائیں ہے مدعا کہ جا تو

کہہ سانجھ کے موئے کو اے میرؔ روئیں کب تک
جیسے چراغ مفلس اک دم میں جل بجھا تو

نالہ مرا اگر سبب شور و شر نہ ہو　　پھر مر بھی جائیے تو کسی کو خبر نہ ہو

ہم سے تو تم کو ضد سی پڑی ہے خواہ نخواہ رُلاتے ہو
آنکھ اٹھا کر جب دیکھیں ہیں اوروں میں ہنستے جاتے ہو
بکھری رہیں ہیں منہ پر زلفیں، آنکھ نہیں کھل سکتی ہے
کیونکہ چھپے میخوارئ شب جب ایسے رات کے ماتے ہو
ہو کے گدائے کوئے محبت زور صدا یہ نکالی ہے
اب تو میرؔ جی راتوں کو تم ہر در پر چلّاتے ہو

وہی جانے جو حیا کشتہ وفا رکھتا ہو — اور رسوائی کا اندیشہ جدا رکھتا ہو
ہائے اس زخمئ شمشیر محبت کا جگر — درد کو اپنے جو ناچار چھپا رکھتا ہو
ایسے تو حال کے کہنے سے بھلی خاموشی — کہیے اس سے جو کوئی اپنا کہا رکھتا ہو

گل ہو مہتاب ہو آئینہ ہو خورشید ہو میرؔ
اپنا محبوب وہی ہے جو ادا رکھتا ہو

چاہ کا دعوی سب کرتے ہیں مانیے کیوں کر بے آثار
اشک کی سرخی زردی منھ کی عشق کی کچھ تو علامت ہو
شور و شغب کو راتوں کے ہمسائے تمھارے کیا روویں
ایسے فتنے کتنے اٹھیں گے میرؔ جی تم جو سلامت ہو

شیخ جی آؤ مصلّیٰ گروِ جام کرو | جنس تقویٰ کے تئیں صرفِ مئے جام کرو

فرشِ مستاں کرو سجّادۂ بے تہ کے تئیں | مے کی تعظیم کرو شیشے کا اکرام کرو

دامنِ پاک کو آلودہ رکھو بادہ سے | آپ کو مغبچوں کے قابلِ دشنام کرو

ننگ و ناموس سے اب گذرو جوانوں کی طرح | پرفشانی کرو اور ساقی سے ابرام کرو

اٹھ کھڑے ہو جو جھکے گردنِ مینائے شراب | خدمتِ بادہ گساراں ہی سر انجام کرو

مطرب آکر جو کرے چنگ نوازی تو تم | پیرہن مستوں کی تقلید سے انعام کرو

خنکی اتنی بھی تو لازم نہیں اس موسم میں | پاس جوشِ گل و دل گرمیِ ایام کرو

سایۂ گل میں لبِ جو پہ گلابی رکھو | ہاتھ میں جام کو لو آپ کو بدنام کرو

آہ تا چند رہو خانقہ و مسجد میں | ایک تو صبح گلستاں میں بھی شام کرو

رات تو ساری گئی سنتے پریشاں گوئی
میرؔ جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو

ایسے ہم پیشہ کہاں ہوتے ہیں اے غم زدگاں | مرگِ مجنوں پہ کڑھو، ماتمِ فرہاد کرو

اے اسیران تہِ دام نہ تڑپھو اتنا | تا نہ بدنام کہیں چنگلِ صیاد کرو

گو کہ حیرانیِ دیدار ہے، اے آہ و سرشک | کوئی روشن کرو آنکھیں کوئی دل شاد کرو

کیا ہوا ہے ابھی تو ہستی ہی کو بھولے ہو | آخرِ کارِ محبّت کو ٹک اک یاد کرو

اوّل عشق ہی میں میرؔ جی تم رونے لگے | خاک ابھی منہ کو ملو، نالہ و فریاد کرو

دل صاف ہو تو جلوہ گہ یار کیوں نہ ہو
آئینہ ہو تو قابل دیدار کیوں نہ ہو

آیاتِ حق ہیں سارے یہ ذرّات کائنات
انکار تجھ کو ہووے سو اقرار کیوں نہ ہو

ہر دم کی تازہ مرگ جدائی سے تنگ ہوں
ہونا جو کچھ ہے آہ، سو یک بار کیوں نہ ہو

مجنوں جو دشت گرد تھا ہم شہر گرد ہیں
آوارگی ہماری بھی مذکور کیوں نہ ہو

خالی نہیں بغل کوئی دیوان سے مرے
افسانہ عشق کا ہے یہ مشہور کیوں نہ ہو

حیراں ہیں اس قدر کہ اگر آب کی جائیے
پھر منھ ترا نہ دیکھیے، تصویر کیوں نہ ہو

وے جو مستِ بے خودی ہیں عیش کرتے ہیں مدام
میکدے میں دہر کے مشکل ہے ٹک ہشیار کو

جو میں نہ ہوں تو کرو ترک ناز کرنے کو
کوئی تو چاہیے جی بھی نیاز کرنے کو

جو بے دماغی یہی ہے تو بن چکی اپنی
دماغ چاہیے ہر اک سے ساز کرنے کو

جو آنسو آویں تو پی جا کہ تا رہے پردہ
بلا ہے چشمِ تر افشاے راز کرنے کو

قیدِ حیات قیدِ کوئی سخت ہے کہ روز
مر رہتے ہیں گے اس کے گرفتار ایک دو

کیا کیا عزیز دوست ملے میرؔ خاک میں
کچھ اس گلی میں ہم ہی نہیں خوار ایک دو

ہوش و صبر و خرد و دین و حواس و دل و تاب — اس کے ایک آنے میں کیا کیا نہ گیا مت پوچھو
اشتعالک کی محبت نے کر در بست پھنکا — شہر دل کیا کہوں، کس طور جلا، مت پوچھو

کیا پھرے وہ وطن آوارہ، گیا اب سو گیا — دل گم کردہ کی کچھ خیر خبر مت پوچھو
ہوں توں کر حال دل اک بار تو میں عرض کیا — میر صاحب جی، بس اب بارِ دگر مت پوچھو

اس کی طرز نگاہ مت پوچھو — جی ہی جانے ہے آہ مت پوچھو
کہیں پہنچو گے بے رہی میں بھی — گم رہاں یوں یہ راہ مت پوچھو
تو گرفتار دام زلف اس کا — ہے یہی روسیاہ مت پوچھو
تھا کرم پر اسی کے شرب مدام — میرے اعمال آہ مت پوچھو
تم بھی اے مالکانِ روز جزا — بخش دو اب گناہ مت پوچھو

میرؔ عاشق کو کچھ کہے ہی بنے
خواہ وہ پوچھو، خواہ مت پوچھو

گریۂ شمع کا اے ہم نفساں میں تھا حریف — گزری ہے رات کی صحبت بھی عجب مت پوچھو
سر پُرشور سے میرے نہ کرو کوئی سوال — حشر تھا داخل خدام ادب، مت پوچھو
لب پہ شیون، مژہ پُرخوں و نگہ میں اک یاس — دن گیا ہجر کا جس ڈھنگ سے شب مت پوچھو

گذرے ہے شب خیال میں خوباں کے جاگتے　　آنکھیں لگا کے اس سے میں ترسوں ہوں خواب کو

کہنے سے میرؔ اور بھی ہوتا ہے مضطرب
سمجھاؤں کب تک اس دل خانہ خراب کو

کیا ہے گر بدنامی و حالت تباہی بھی نہ ہو　　عشق کیسا جس میں اتنی رو سیاہی بھی نہ ہو

چاہتا ہے جی کہ ہم تو، ایک جا، تنہا ملیں　　ناز بے جا بھی نہ ہووے کم نگاہی بھی نہ ہو

واماندگی نے مارا اثنائے رہ میں ہم کو　　معلوم ہے پہنچنا اب کارواں تلک تو

افسانہ غم کا لب تک آیا ہے مدتوں میں　　سو جائیو نہ پیارے اس داستاں تلک تو

اے کاش خاک ہی ہم رہتے کہ میرؔ اس میں　　ہوتی ہمیں رسائی اس آستاں تلک تو

اک آن گذر جائے تو کہنے میں کچھ آوے　　درپیش ہے یاں مردن دشوار ہمیشہ

جو بن ترے دیکھے موا دوزخ میں ہے یعنی　　رہتی ہے اُسے حسرت دیدار ہمیشہ

چمن میں دل خراش آواز آتی ہے چلی شاید　　پس دیوار گلشن نالہ کش ہے کوئی پر بستہ

تعجب ہے مجھے یہ سرو کو آزاد کہتے ہیں　　سراپا دل کی صورت جس کی ہو وہ کیا ہو وارستہ

ہم ہیں مجروح ماجرا ہے یہ — وہ نمک چھڑکے ہے مزا ہے یہ

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم — اب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ

بودِ آدم نمود شبنم ہے — ایک دو دم میں پھر ہوا ہے یہ

ہے رے بیگانگی کبھو اُن نے — نہ کہا یہ کہ آشنا ہے یہ

میرؔ کو کیوں نہ مغتنم جانیں

اگلے لوگوں میں اک رہا ہے یہ

منزلِ مستی کو پہنچے ہے انھیں سے عالَم — نشّۂ مے بلد، و سنگِ نشاں ہے شیشہ

جاکے پوچھا جو میں یہ کارگہ مینا میں — ق دل کی صورت کا بھی اے شیشہ گراں ہے شیشہ

کہنے لاگا کہ کدھر پھرتا ہے بہکا اے مست — ہر طرح کا جو تو دیکھے ہے کہ یاں ہے شیشہ

دل ہی سارے تھے یہ اک وقت میں، جو کر کے گداز — شکل شیشے کی بناتے ہیں، کہاں ہے شیشہ

جھک گیا دیکھ کے میں میرؔ اُسے مجلس میں

چشم بد دور، طرح دار جواں ہے شیشہ

جی چاہے مل کسو سے یا سب سے تو جُدا رہ — پر ہو سکے تو پیارے ٹک دل کا آشنا رہ

کل بے تکلفی میں لطف اِس بدن کا دیکھا — نکلا نہ کر قبا سے، اے گل بس اب ڈھپا رہ

یہ مشت خاک یاں کی چاہے ہے اک تامل — بن سوچے راہ مت چل، ہر گام پر کھڑا رہ
شاید کہ سربلندی ہووے نصیب تیرے — جوں گرد راہ سب کے پانوں سے تو لگا رہ
جیسے خیالِ مفلس، جاتا ہے سو جگہ تو — مجھ بے نوا کے گھر بھی اک آدھ رات آ رہ
دوڑے بہت ولیکن مطلب کو کون پہنچا — آئندہ تو بھی ہم سا ہو کر شکستہ پا رہ

جب ہوش میں تو آیا، اودھر ہی جاتے پایا
اس سے تو میرؔ چندے اس کوچے ہی میں جا رہ

اب حال اپنا اُس کے ہے دل خواہ — کیا پوچھتے ہو الحمد للہ
پیر مغاں سے بے اعتقادی؟ — استغفر اللہ، استغفر اللہ
مجرم ہوئے ہم دل دے کے ورنہ — کس کو کسو سے ہوتی نہیں چاہ
ہے ما سوا کیا جو میرؔ کہیے — آگاہ سارے اس سے ہیں آگاہ
جلوے ہیں اس کے شانیں ہیں اس کی — کیا روز کیا خور کیا رات کیا ماہ

ظاہر کہ باطن اوّل کہ آخر
اللہ اللہ - اللہ اللہ

بے تابیوں کو سونپ نہ دینا کہیں مجھے — اے صبر میں نے آن کے لی ہے تری پناہ
ناحق الجھ پڑا ہے یہ مجھ سے طریقِ عشق — جاتا تھا میرؔ میں تو چلا اپنی راہ راہ

سعی اتنی یہ ضروری ہے اُٹھے بزم سلگ
اے جگر تفتگیِ بے اثرِ پروانہ

کس گنہ کا ہے پس از مرگ یہ عذر جاں سوز
پانو پر شمع کے پاتے ہیں سرِ پروانہ

بزمِ دنیا کی تو دلسوزی سنی ہوگی میرؔ
کس طرح شام ہوئی یاں سحر پروانہ

ہم سے کچھ آگے زمانے میں ہوا کیا کیا کچھ
تو بھی ہم غافلوں نے آکے کیا، کیا کیا کچھ

دل جگر جان یہ بھسمنت ہوئے سینے میں
گھر کو آتش دی محبّت نے، جلا کیا کیا کچھ

کیا کہوں تجھ سے کہ کیا دیکھا ہے تجھ میں میں نے
عشوہ و غمزہ و انداز و ادا کیا کیا کچھ

دل گیا، ہوش گیا، صبر گیا، جی بھی گیا
شغل میں غم کے ترے ہم سے گیا کیا کیا کچھ

آہ مت پوچھ ستم گار کہ تجھ سے تھی ہمیں
چشمِ لطف و کرم و مہر و وفا کیا کیا کچھ

حسرت وصل و غم ہجر و خیال رخ دوست
مر گیا میں، یہ مرے جی میں رہا کیا کیا کچھ

درد دل، زخم جگر، کلفت غم، داغ فراق
آہ عالم سے مرے ساتھ چلا کیا کیا کچھ

چشم نم ناک و دل پُر، جگر صد پارہ
دولت عشق سے ہم پاس بھی تھا کیا کیا کچھ

تجھ کو کیا بننے بگڑنے سے زمانے کے کہ یاں
خاک کن کن کی ہوئی صرفِ بنا کیا کیا کچھ

ایک محروم چلے میرؔ ہمیں دنیا سے
ورنہ عالم کو زمانے نے دیا کیا کیا کچھ

رات مجلس میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے　　جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ
وے دن اب سالتے ہیں راتوں کو، برسوں گذرے　　جن دنوں دیر رہا کرتے تھے ہم یار کے ساتھ
ذکرِ گل کیا ہے صبا اب، کہ خزاں میں ہم نے　　دل کو ناچار لگایا ہے خس و خار کے ساتھ
کس کو ہر دم ہے لہو رونے کا ہجراں میں دماغ　　دل کو اک ربط سا ہے دیدۂ خونبار کے ساتھ

دل کو تسکین نہیں اشک دما دم سے بھی　　اس زمانے میں گئی ہے برکت غم سے بھی
کاش اے جان الم ناک نکل جاوے تو　　اب تو دیکھا نہیں جاتا یہ ستم ہم سے بھی
آہ ہر غیر سے تا چند کہوں دل کی بات　　عشق کا راز تو کہتے نہیں محرم سے بھی
ہمّت اپنی ہی تھی یہ میرؔ کہ جوں مرغِ خیال　　اک پرافشانی میں گذرے سرِ عالم سے بھی

چھوٹتا کب ہے اسیر خوش زباں　　جیتے جی اپنی رہائی ہو چکی
بیچ میں ہم ہی نہ ہوں تو لطف کیا　　رحم کر اب، بے وفائی ہو چکی

دل کس قدر شگفتہ ہوا تھا کہ رات میرؔ　　آئی جو بات لب پہ، سو فریاد بن گئی

یہ چشم آئنہ دارِ رو تھی کسو کی　　نظر اس طرف بھی کبھو تھی کسو کی
سحر پائے گل بے خودی ہم کو آئی　　کہ اُس سست پیما میں بُو تھی کسو کی

یہ سرگشتہ جب تک رہا اس چمن میں　　برنگِ صبا جستجو تھی کسو کی
دم مرگ دشوار دی جان ان نے
مگر میرؔ کو آرزو تھی کسو کی

اس کے ایفائے عہد تک نہ جیے　　عمر نے ہم سے بے وفائی کی
اسی تقریب اس گلی میں رہے　　منتیں ہیں شکستہ پائی کی
کاسۂ چشم لے کے جوں نرگس　　ہم نے دیدار کی گدائی کی
زور و زر کچھ نہ تھا تو بارے میرؔ
کس بھروسے پر آشنائی کی

عالمِ جاں سے تو نہیں آیا　　ایک آفت جہان پر آئی
طاقتِ دل، برنگ نکہت گل　　پھیر اپنے مکان پر آئی
ہو جہاں میرؔ اور غم اس کا
جس سے عالم کی جان پر آئی

دن رات مری چھاتی جلتی ہے محبت میں　　کیا اور نہ تھی جاگہ یہ آگ جو یاں دابی
تھے ماہ وشاں کل جو، ان کوٹھوں پہ جلوے میں　　ہے خاک سے آج اُن کی ہر صحن میں مہتابی

ہمیں آمدِ میرؔ کل بھا گئی — طرح اس میں مجنوں کی سب پا گئی

جگر منہ تک آتے نہیں بولتے — غرض ہم بھی کرتے ہیں کیا کیا گئی

کوئی رہنے والی ہے جانِ عزیز — گئی گر نہ امروز، فردا گئی

تکلیف نالہ مت کر اے درد دل کہ ہوں گے

رنجیدہ راہ چلتے، آزردہ ہم نشیں بھی

کس کس کا داغ دیکھیں یارب غم بتاں میں

رخصت طلب ہے جاں بھی، ایمان اور دیں بھی

زیر فلک جہاں ٹک آسودہ میرؔ ہوتے

ایسا نظر نہ آیا اک قطعۂ زمیں بھی

تجھے کیونکے ڈھونڈوں کہ سوتے ہی گذری — تری راہ میں اپنے پائے طلب کی

عجب کچھ ہے گر میرؔ آوے میسر — گلابی شراب اور غزل اپنے ڈھب کی

کس پاس جا کے بیٹھوں خرابے میں اب میں ہائے — مجنوں کو موت کیسی شتابی سے آ گئی

سودا جو اس کے سر سے گیا زلف یار کا — تو تو بڑی ہی میرؔ کے سر سے بلا گئی

اٹھائی ننگ سمجھ تم نے بات کے کہتے　　　　وفا و مہر جو تھی رسم ایک مدّت کی

کیا جلی جاتی ہے خوبی ہی میں اپنی اے شمع　　　　کہہ پتنگے کے بھی کچھ شام و سحر کرنے کی

خرابی کچھ نہ پوچھو ملکت دل کی عمارت کی　　　　غموں نے آج کل سنیو وہ آبادی ہی غارت کی

نگاہ مست سے جب چشم نے اس کی اشارت کی　　　　حلاوت مے کی اور بنیاد میخانے کی غارت کی

ترے کوچے کے شوق طوف میں جیسے بگولا تھا

بیاباں میں غبارِ میرؔ کی ہم نے زیارت کی

آتی ہے شمع شب کو آگے ترے یہ کہہ کر　　　　منہ سے گئی جو لوئی تو کیا کرے گا کوئی

بے طاقتی سے آگے کچھ پوچھتا بھی تھا سو　　　　رونے نے ہر گھڑی کے وہ بات ہی ڈبوئی

اس مہ کے جلوے سے کچھ تا میرؔ یاد دیوے

اب کے گھروں میں ہم نے سب چاندنی ہے بوئی

چمن کا نام سنا تھا ولے نہ دیکھا ہائے　　　　جہاں میں ہم نے قفس ہی میں زندگانی کی

کیسی کیسی صحبتیں آنکھوں کے آگے سے گئیں　　　　دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہوگیا یک بارگی

روے گل پر روز و شب کس شوق سے رہتا ہے باز　　رخنۂ دیوار ہے یا دیدۂ نظارگی

واشُد کچھ آگے آہ سے ہوتی تھی دل کے تئیں　　اقلیم عاشقی کی ہوا اب بگڑ گئی
باہم سلوک تھا تو اٹھاتے تھے نرم گرم　　کاہے کو میرؔ کوئی دبے جب بگڑ گئی

کچھ موج ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی　　شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی
دلّی کے نہ تھے کوچے اوراق مصوّر تھے　　جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی
گل بار کرے ہے گا اسباب سفر شاید　　غنچے کی طرح بلبل دلگیر نظر آئی

ہوگئی شہر شہر رسوائی　　اے مری موت تو بھلی آئی
یک بیاباں برنگ صوت جرس　　مجھ پہ ہے بیکسی وتنہائی

میرؔ جب سے گیا ہے دل تب سے
میں تو کچھ ہوگیا ہوں سودائی

مجھ سا بیتاب ہووے جب کوئی　　بے قراری کو جانے تب کوئی
ہاں خدا مغفرت کرے اس کو　　صبر مرحوم تھا عجب کوئی
بعد میرے ہی ہوگیا سنسان　　سونے پایا تھا ورنہ کب کوئی

اور محزوں بھی ہم سُنے تھے ولے   ق   میرؔ سا ہو سکے ہے کب کوئی
کہ تلفّظ طرب کا سن کے کہے
شخص ہوگا کہیں طرب کوئی

بیگانہ سا لگے ہے چمن اب خزاں میں ہائے   ایسی گئی بہار، مگر آشنا نہ تھی
آگے بھی تیرے عشق سے کھینچے تھے درد و رنج   لیکن ہماری جان پر ایسی بلا نہ تھی
اس وقت سے کیا ہے مجھے تو چراغِ وقف   مخلوق جب جہاں میں نسیم و صبا نہ تھی
پژمردہ اس قدر ہیں کہ ہے شبہ ہم کو میرؔ
تن میں ہمارے جان کبھو تھی بھی یا نہ تھی

وے ہی چالاکیاں ہاتھوں کی ہیں جو اوّل تھیں
اب گریباں میں مرے رہ گئے ہیں تار کئی
اضطراب و تلق و ضعف میں کس طور جیوں
جان واحد ہے مری اور ہیں آزار کئی

میری پرسش پہ تری طبع اگر آوے گی   صورتِ حال تجھے آپھی نظر آوے گی
کتنے پیغام چمن کو ہیں سو دل میں ہیں گرہ   کسو دن ہم تئیں بھی بادِ سحر آوے گی

کیا کروں شرح خستہ جانی کی　　میں نے مر مر کے زندگانی کی
حال بد گفتنی نہیں میرا　　تم نے پوچھا تو مہربانی کی
جس سے کھوئی تھی نیند میرؔ نے کل
ابتدا پھر وہی کہانی کی

ہے یہ بازارِ جنوں منڈی ہے دیوانوں کی　　یاں دکانیں ہیں کئی چاک گریبانوں کی
دل و دیں کیسے کہ اس رہزنِ دلہا سے اب　　یہ پڑی ہے کہ خدا خیر کرے جانوں کی
کتنے دل سوختہ ہم جمع ہیں اے غیرت شمع　　کر قدم رنجہ کہ مجلس ہے یہ پروانوں کی

لگے در بدر میرؔ چلاّتے پھرنے　　گدا تو ہوئے پر صدا کیا نکالی

رہی نگفتہ مرے دل میں داستاں میری　　نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری
برنگ صوت جرس تجھ سے دور ہوں تنہا　　خبر نہیں ہے تجھے آہ کارواں میری
اسی سے دور رہا اصل مدّعا جو تھا　　گئی یہ عمر عزیز آہ رائگاں میری
ترے فراق میں جیسے خیال مفلس کا　　گئی ہے فکر پریشاں کہاں کہاں میری
رہا میں درپسِ دیوارِ باغ مدّت لیک　　گئی گلوں کے نہ کانوں تلک فغاں میری

اب کے بھی سیر باغ کی جی میں ہوس رہی　　اپنی جگہ بہار میں کنج قفس رہی
میں پاشکستہ جا نہ سکا قافلے تلک　　آتی اگرچہ دیر صدائے جرس رہی

آج کل بے قرار ہیں ہم بھی　　بیٹھ جا چلنے ہار ہیں ہم بھی
آن میں کچھ ہیں آن میں کچھ ہیں　　تحفۂ روزگار ہیں ہم بھی
منع گریہ نہ کر تو اے ناصح　　اس میں بے اختیار ہیں ہم بھی
گرز خود رفتہ ہیں ترے نزدیک　　اپنی تو یادگار ہیں ہم بھی

غفلت میں گئی آہ مری ساری جوانی　　اے عمر گذشتہ میں تری قدر نہ جانی
بھاتی ہے مجھے اک طلب بوسہ میں یہ آن　　لکنت سے الجھ جا کے اُسے بات نہ آنی

کل بارے ہم سے اس سے ملاقات ہوگئی　　دو دو بچن کے ہوتے میں اک بات ہوگئی
خورشید سا پیالۂ مے بے طلب دیا　　پیر مغاں سے رات کرامات ہوگئی
اپنے تو ہونٹھ بھی نہ ہلے اس کے روبرو　　رنجش کی وجہ میرؔ وہ کیا بات ہوگئی

کوئی ہو محرم شوخی ترا تو میں پوچھوں　　کہ بزمِ عیشِ جہاں کیا سمجھ کے برہم کی

صد حرف زیر خاک تہ دل چلے گئے
مہلت نہ دی اجل نے ہمیں ایک بات کی
ہم تو ہی اس زمانے میں حیرت سے چپ نہیں
اب بات جا چکی ہے سبھی کائنات کی
عرصہ ہے تنگ چال نکلتی نہیں ہے اور
جو چال پڑتی ہے سو وہ بازی کی مات کی

رکھنا نہ تھا قدم یاں جوں بادبے تامّل
سیر اس جہاں کی رہرو پر تو نے سرسری کی
پائے گل اس چمن میں چھوڑا گیا نہ ہم سے
سر پر ہمارے اب کے منّت ہے بے پری کی
پیشہ تو ایک ہی تھا اس کا ہمارا لیکن
مجنوں کے طالعوں نے شہرت میں یاوری کی
یہ دور تو موافق ہوتا نہیں مگر اب
رکھیے بنائے تازہ اس چرخ چنبری کی

دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے
گور کس دل جلے کی ہے یہ فلک
شعلہ اک صبح یاں سے اٹھتا ہے
خانۂ دل سے زینہار نہ جا
کوئی ایسے مکاں سے اٹھتا ہے
سُدھ لے گھر کی بھی شعلہ آواز
دوُد اک آشیاں سے اٹھتا ہے
بیٹھنے کون دے ہے پھر اس کو
جو ترے آستاں سے اٹھتا ہے
یوں اٹھے آہ اُس گلی سے ہم
جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے
عشق اک میرؔ بھاری پتّھر ہے
کب یہ تجھ ناتواں سے اٹھتا ہے

فرصت میں یک نفس کی کیا درد دل سنوگے / آئے تو تم و لیکن وقت اخیر آئے
دلّی میں اب کی آکر اُن یاروں کو نہ دیکھا / کچھ وے گئے شتابی کچھ ہم بھی دیر آئے
بِن جی دیے نہیں ہے امکان یاں سے جانا / بسمل گہ جہاں میں اب ہم تو میرؔ آئے

کب سے نظر لگی تھی دروازۂ حرم سے / پردہ اٹھا تو لڑیاں نظریں ہماری ہم سے
کڑھیے نہ روئیے تو اوقات کیوں کہ گذرے / رہتا ہے مشغلہ سا بارے غم والم سے
بات احتیاط سے کر، ضائع نہ کر نفس کو / بالیدگیِ دل ہے مانندِ شیشہ دم سے
کیا کیا تعب اٹھائے کیا کیا عذاب دیکھے / تب دل ہوا ہے اتنا خوگر ترے ستم سے
ہستی میں ہم نے آکر آسودگی نہ دیکھی / کھلتیں نہ کاش آنکھیں خوابِ خوشِ عدم سے
پامال کرکے ہم کو پچھتاؤ گے بہت تم / کمیاب ہیں جہاں میں سر دینے والے ہم سے

گئے جی سے، چھوٹے بتوں کی جفا سے / یہی بات ہم چاہتے تھے خدا سے
وہ اپنی ہی خوبی پہ رہتا ہے نازاں / مرو یا جیو کوئی اُس کی بلا سے
نہ شکوہ شکایت، نہ حرف وحکایت / کہو میرؔ جی آج کیوں ہو خفا سے

بلا کا شکر کر اے دل کہ اب معلوم ہوتی ہے / حقیقت عافیت کی، اس گلی کے رہنے والوں سے
نہیں خالی اثر سے، تصفیہ دل کا محبّت میں / کہ آئینے کو ربط خاص ہے صاحب جمالوں سے

اندوہِ وصل و ہجر نے عالَم کھپا دیا ان دو ہی منزلوں میں بہت یار تھک گئے

ہوچکا روزِ جزا، اب اے شہیدان وفا چونکتے ہیں خونِ خفتہ کب تمھارے دیکھیے
راہِ دورِ عشق میں اب تو رکھا ہم نے قدم رفتہ رفتہ پیش کیا آتا ہے بارے دیکھیے
رہ گئے سوتے کے سوتے کارواں جاتا رہا
ہم تو میرؔ اس رہ کے خوابیدہ ہیں، بارے دیکھیے

کس طور ہمیں کوئی فریبندہ لُبھالے آخر ہیں تری آنکھوں کے ہم دیکھنے والے
عشق اُن کو ہے جو یار کو اپنے دم رفتن کرتے نہیں غیرت سے خدا کے بھی حوالے
احوال بہت تنگ ہے، اے کاش محبّت اب دستِ تلطّف کو مرے سر سے اُٹھالے
کہتے ہیں حجاب رخ دلدار ہے ہستی دیکھیں گے، اگر یوں ہے، بھلا جان بھی جالے

برنگ بوے گل اس باغ کے ہم آشنا ہوتے کہ ہمراہ صبا ٹک سیر کرتے، پھر ہوا ہوتے
سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو وگرنہ ہم خدا تھے گر دل بے مدعا ہوتے
فلک اے کاش ہم کو خاک ہی رکھتا کہ اس میں ہم غبار راہ ہوتے یا کسو کی خاک پا ہوتے
الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی خواہش ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے
اب ایسے ہیں، کہ صانع کے مزاج اوپر بہم پہنچے جو خاطر خواہ اپنے ہم ہوئے ہوتے تو کیا ہوتے

کہیں جو کچھ ملامت گر، بجا ہے میرؔ، کیا جانیں
انھیں معلوم تب ہوتا کہ ویسے سے جدا ہوتے

چمن، یار تیرا ہوا خواہ ہے — گُل اک دل ہے جس میں تری چاہ ہے
سراپا میں اس کے نظر کر کے تم — جہاں دیکھو اللہ اللہ ہے
تری آہ کس سے خبر پائیے — وہی بے خبر ہے جو آگاہ ہے
مرے لب پہ رکھ کان، آواز سن — کہ اب تک بھی یک ناتواں آہ ہے
یہ وہ کارواں گاہِ دلکش ہے میرؔ
کہ پھریاں سے حسرت ہی ہمراہ ہے

ڈھب ہیں تیرے سے باغ میں گل کے — بو گئی کچھ دماغ میں گل کے
دل تسلّی نہیں صبا ورنہ — جلوے سب ہیں گے داغ میں گل کے
اس حدیقے کے عیش پر مت جا — مے نہیں ہے ایاغ میں گل کے
سیر کر میرؔ اس چمن کی شتاب
ہے خزاں بھی سراغ میں دل کے

قابلِ آغوشِ ستم دیدگاں — اشک سا پاکیزہ گہر چاہیے

حال یہ پہنچا ہے کہ اب ضعف سے ۔۔۔ اٹھتے پلک ایک پہر چاہیے
کم ہیں شناسائے زرِ داغ دل ۔۔۔ اس کے پرکھنے کو نظر چاہیے
شرط سلیقہ ہے ہر اک امر میں ۔۔۔ عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے
خوف قیامت کا یہی ہے کہ میرؔ
ہم کو جیا بار دگر چاہیے

ہستی اپنی حباب کی سی ہے ۔۔۔ یہ نمایش سراب کی سی ہے
نازکی اس کے لب کی کیا کہیے ۔۔۔ پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں ۔۔۔ حالت اب اضطراب کی سی ہے
میں جو بولا، کہا کہ یہ آواز ۔۔۔ اسی خانہ خراب کی سی ہے
میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

شمع صفت جب کبھو مر جائیں گے ۔۔۔ ساتھ لیے داغ جگر جائیں گے
خالی نہ چھوڑیں گے ہم اپنی جگہ ۔۔۔ گر یہی رونا ہے تو بھر جائیں گے

اب جو اک حسرتِ جوانی ہے ۔۔۔ عمر رفتہ کی یہ نشانی ہے

رشکِ یوسف ہے آہ وقتِ عزیز — عمر اک بارِ کاروانی ہے
گریہ ہر وقت کا نہیں بے ہیچ — دل میں کوئی غم نہانی ہے
ہم قفس زاد قیدی ہیں ورنہ — تا چمن ایک پر فشانی ہے
خاک تھی موج زن جہاں میں، اور — ہم کو دھوکا یہ تھا کہ پانی ہے

قیامت ہیں یہ چسپاں جامے والے — گلوں نے جن کی خاطر خرقے ڈالے
نہیں اُٹھتا دل محزوں کا ماتم — خدا ہی اس مصیبت سے نکالے
نہ مہکے بوے گل اے کاش یک چند — ابھی زخم جگر سارے ہیں آلے

سرمایۂ صد آفت دیدار کی خواہش ہے — دل کی تو سمجھ لیجے گر چشم کہا مانے
مسدود ہی اے قاصد بہتر ہے رہِ نامہ — کیا کیا نہ لکھیں ہم تو، گر یار لکھا مانے
ٹک حال شکستہ کی سننے ہی میں سب کچھ ہے — پر وہ تو سخن رس ہے، اس بات کو کیا مانے

بے طاقتیِ دل نے سائل بھی کیا ہم کو
پر میرؔ فقیروں کی یاں کون صدا مانے

دل کے معمورے کی مت کر فکر، فرصت چاہیے — ایسے ویرانے کے اب بسنے کو مدّت چاہیے
عشق و میخواری نبھے ہے کوئی درویشی کے بیچ — اس طرح کے خرج لاحاصل کو دولت چاہیے

عاقبت فرہاد مرکر کام اپنا کر گیا آدمی ہووے کسی پیشے میں، جرأت چاہیے
عشق میں وصل وجدائی سے نہیں کچھ گفتگو قرب وبُعد اس جا برابر ہے، محبّت چاہیے
تنگ مت ہو ابتدائے عاشقی میں اس قدر
خیریت ہے میرؔ صاحب دل سلامت چاہیے

بے یار شہر دل کا ویران ہو رہا ہے دکھلائی دے جہاں تک، میدان ہو رہا ہے
اس منزلِ جہاں کے باشندے رفتنی ہیں ہر اک کے ہاں سفر کا سامان ہو رہا ہے
اچھا لگا ہے شاید آنکھوں میں یار اپنی آئینہ دیکھ کر کچھ حیران ہو رہا ہے
گُل دیکھ کر چمن میں تجھ کو کھلا ہی جا ہے یعنی ہزار جی سے قربان ہو رہا ہے
قرباں گہِ محبّت وہ جا ہے جس میں ہر سُو دشوار جان دینا آسان ہو رہا ہے

آزردہ خاطروں سے کیا فائدہ سخن کا تم حرف سر کرو گے ہم گریہ سر کریں گے
عذرِ گناہِ خوباں، بدتر گنہ سے ہو گا کرتے ہوئے تلافی بے لطف تر کریں گے
اپنی خبر بھی ہم کو اب دیر پہنچتی ہے کیا جانے یار اس کو کب تک خبر کریں گے
گر دل کی تاب و طاقت یہ ہے تو ہم نشیں ہم شامِ غمِ جدائی کیوں کر سحر کریں گے
یہ ظلم بے نہایت دیکھو تو خوبرویاں کہتے ہیں جو ستم ہے ہم تجھ ہی پر کریں گے
صنّاع طُرفہ ہیں ہم عالم میں ریختے کے جو میرؔ جی لگے گا تو سب ہنر کریں گے

تجھ سے دوچار ہوگا جو کوئی راہ جاتے   پھر عمر چاہیے گی اس کو بحال آتے
شب کو تہ اور قصہ اُن کا دراز ورنہ   احوال میرؔ صاحب ہم تجھ کو سب سناتے

بہت دور کوئی رہا ہے مگر   کہ فریاد میں ہے جرس شور سے
جو ہو میرؔ بھی اس گلی میں صبا
بہت پوچھیو تو مری اُور سے

یاں سرکشاں جو صاحبِ تاج ولوا ہوئے   پامال ہوگئے تو نہ جانا کہ کیا ہوئے
دیکھی نہ ایک چشمکِ گل بھی چمن میں آہ   ہم آخرِ بہار قفس سے رہا ہوئے
پچھتاؤگے بہت جو گئے ہم جہان سے   آدم کی قدر ہوتی ہے ظاہر جدا ہوئے
تجھ بن دماغ صحبت اہلِ چمن نہ تھا   گل وا ہوئے ہزار ولے ہم نہ وا ہوئے
سر دے کے ہم نے میرؔ فراغت کی عشق میں
ذمّہ ہمارے بوجھ تھا بارے ادا ہوئے

رنج کھینچے تھے داغ کھائے تھے   دل نے صدمے بڑے اُٹھائے تھے
پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ   کتنے آنسو پلک تک آئے تھے
اب جہاں آفتاب میں ہم ہیں   یاں کبھو سرو و گل کے سائے تھے

کچھ نہ سمجھے کہ تجھ سے یاروں نے　　　کس توقع پہ دل لگائے تھے

میرؔ صاحب رلا گئے سب کو

کل وے تشریف یاں بھی لائے تھے

ہمیں غش آگیا تھا وہ بدن دیکھ　　　بڑی کلول ٹلی ہے جان پر سے

کہاں ہیں آدمی عالم میں پیدا　　　خدائی صدقے کی انسان پر سے

تفنگ اس کی چلی آواز پر لیک　　　گئی ہے میرؔ گولی کان پر سے

خوب ہے اے ابر اک شب آؤ باہم روئیے　　　پر نہ اتنا بھی کہ ڈوبے شہر، کم کم روئیے

وقت خوش دیکھا نہ اک دم سے زیادہ دہر میں　　　خندۂ صبح چمن پر مثل شبنم روئیے

شادی و غم میں جہاں کی ایک سے دس کا ہے فرق　　　عید کے دن ہنسیے تو دس دن محرم روئیے

دیکھا ماتم خانۂ عالم کو ہم مانند ابر　　　ہر جگہ پر جی میں یوں آیا دمادم روئیے

ہو جدا فردوس سے، یعنی گلی سے یار کی　　　مدتوں تک کیجیے غم، مثل آدم روئیے

اب سے یوں کریے مقرر اٹھیے جب کہسار سے　　　وادی مجنوں پہ بھی اے ابر اک دم روئیے

عشق میں تقریب گریہ گو نہیں درکار میرؔ

ایک مدت صبر ہی کا رکھیے ماتم روئیے

کیا چھپیں شہر محبت میں ترے خانہ خراب گھر کے گھر ان کے ہیں اس بستی میں ویران ہوئے
سبزہ ولالہ وگل ابرو ہوا ہے، مے دے ساقی ہم توبہ کے کرنے سے پشیمان ہوئے
اپنے جی ہی نے نہ چاہا کہ پییں آب حیات
یوں تو ہم میرؔ اسی چشمے پہ بے جان ہوئے

یارب کوئی ہو عشق کا بیمار نہ ہووے مر جائے ولے اس کو یہ آزار نہ ہووے
زنداں میں پھنسے، طوق پڑے، قید میں مرجائے پر دام محبّت میں گرفتار نہ ہووے
پژمردہ بہت ہے گل گلزار ہمارا شرمندۂ یک گوشۂ دستار نہ ہووے
صحرائے محبّت ہے قدم دیکھ کے رکھ میرؔ
یہ سیرِ سر کوچہ و بازار نہ ہووے

ہم آپ سے جاتے رہے ہیں ذوق خبر میں اے جانِ بلب آمدہ، رہ، تا خبر آوے
کہتے ہیں ترے کوچے سے میرؔ آنے کہے ہے
جب جانیے وہ خانہ خراب اپنے گھر آوے

جب نام ترا لیجیے تب چشم بھر آوے اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے
دیواروں سے سر مارتے پھرنے کا گیا وقت اب تو ہی مگر آپ کبھو در سے در آوے

صناع ہیں سب خوار، ازاں جملہ ہوں میں بھی — ہے عیب بڑا اس میں جسے کچھ ہنر آوے

دی آگ دل کو محبّت نے جب سے پھرتا ہوں — میں جس طرح کسو کا خاناں جل جاوے
ہزار حیف کہ دل خار و خس سے باندھے کوئی — خزاں میں برق گرے آشیان جل جاوے

حرم کو جائیے یا دَیر میں بسر کریے — تری تلاش میں اک دل کدھر کدھر کریے
کٹے ہے دیکھیے یوں عمر کب تلک اپنی — کہ سنیے نام ترا اور چشم تر کریے
ہوا ہے دن تو جدائی کا سو تعب سے شام — شب فراق کس امید پر سحر کریے

مشہور چمن میں تری گل پیرہنی ہے — قربان ترے ہر عضو پہ نازک بدنی ہے
ہوں گرم سفر، شام غریباں سے خوشی ہوں — اے صبح وطن تو تو مجھے بے وطنی ہے

اب کر کے فراموش تو ناشاد کرو گے — پر ہم جو نہ ہوں گے تو بہت یاد کرو گے
اس دشت میں اے راہ رواں ہر قدم اوپر — مانند جرس نالہ و فریاد کرو گے

جنسِ دل دونوں جہاں جس کی بہا تھی اس کا — یک نگہ مول ہوا، تم نہ خریدار ہوئے
عشق وہ ہے کہ جو تھے خلوتی منزلِ قدس — وے بھی رسوائے سرِ کوچہ و بازار ہوئے

وعدۂ حشر تو موہوم نہ سمجھے ہم آہ کس توقع پہ ترے طالبِ دیدار ہوئے

ابھی اک عمر رونا ہے نہ کھوؤ اشک آنکھو تم کرو کچھ سوجھتا اپنا تو بہتر ہے کہ دنیا ہے

ہوا مذکور نام اس کا کہ آنسو بہہ چلے منھ پر ہمارے کام سارے دیدۂ تر ہی ڈبوتا ہے

نہ کی نشو و نما کامل، نہ کام اپنا کیا حاصل فلک کوئی بھی دل سے تخم گہہ بے وقت بوتا ہے

نہ رکھو کان نظمِ شاعران حال پر اتنے
چلو ٹک میرؔ کو سننے کہ موتی سے پروتا ہے

باغ کو تجھ بن اپنی بھائیں آتش دی ہے بہاراں نے
ہر غنچہ اخگر ہے ہم کو ہر گل اک انگارا ہے
بال کھلے وہ شب کو شاید بسترِ ناز پہ سوتا تھا
آئی نسیم صبح جو ایدھر پھیلا عنبر سارا ہے
کس دن دامن کھینچ کے ان نے یار سے اپنا کام لیا
مدت گذری دیکھتے ہم کو، میرؔ بھی اک ناکارہ ہے

درویش ہیں ہم آخر، دو اک نگہ کی رخصت
گوشے میں بیٹھے پیارے تم کو دعا کریں گے
لائی تری گلی تک آوارگی ہماری
ذلت کی اپنی اب ہم عزت کیا کریں گے
احوال میرؔ کیوں کر آخر ہو ایک شب میں
اک عمر ہم یہ قصہ تم سے کہا کریں گے

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے　　اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے
ایسی ہستی عدم میں داخل ہے　　ق　نے جواں ہم نہ طفلِ شیر ہوئے
ایک دم تھی نمود بود اپنی　　یا سفیدی کی یا اخیر ہوئے
یعنی مانند صبح دنیا میں　　ہم جو پیدا ہوئے سو پیر ہوئے

توجہ تیری اے حیرت مری آنکھوں پہ کیا کم ہے
جو میں ہر اک مژہ دیکھوں کہ یہ تر ہے کہ یہ نم ہے
کہیں آشفتگاں سے میرؔ مقصد ہووے ہے حاصل
جو زلفیں اس کی درہم ہیں مرا بھی کام برہم ہے

راہ سب کو ہے خدا سے، جان اگر پہنچا ہے تو
ہوں طریقے مختلف کتنے ہی منزل ایک ہے

جب تک کڑی اٹھائی گئی ہم کڑے رہے
ایک ایک سخت بات پہ برسوں اڑے رہے
اب کیا کریں نہ صبر ہے دل کو نہ جی میں تاب
کل اس گلی میں آٹھ پہر غش پڑے رہے

مرتا ہے کیوں تو ناحق یاری برادری پر
دنیا کے سارے ناتے ہیں جیتے جی تلک کے

قرارِ دل کا یہ کاہے کو ڈھنگ تھا آگے
ہمارے چہرے کے اوپر بھی رنگ تھا آگے
اٹھائیں تیرے لیے بدزبانیاں ان کی
جنھوں کی ہم کو خوشامد سے ننگ تھا آگے

ہم نے بھی سیر کی تھی چمن کی پر اے نسیم
اُٹھتے ہی آشیاں سے گرفتار ہو گئے
وہ تو گلے لگا ہوا سوتا تھا خواب میں
بخت اپنے سو گئے کہ جو بیدار ہو گئے
کیسے ہیں وے کہ جیتے ہیں صد سال، ہم تو میرؔ
اس چار دن کی زیست میں بیزار ہو گئے

اب کے بگڑے گی اگر ان سے تو اس شہر سے جا
کسی ویرانے میں تکیہ ہی بنا بیٹھیں گے
جانہ اظہارِ محبّت پہ ہوسناکوں کی
وقت کے وقت یہ سب منھ کو چھپا بیٹھیں گے

نالہ تا آسمان جاتا ہے　　شور سے، جیسے بان جاتا ہے
دل عجب جائے ہے ولیکن مفت　　ہاتھ سے یہ مکان جاتا ہے
عشق کے داغ کا عبث ہے علاج　　اب کوئی یہ نشان جاتا ہے
میرؔ گو عمر طبعی کو پہنچا
عشق میں جوں جوان جاتا ہے

مرہی جاویں گے بہت ہجر میں ناشاد رہے　　بھول تو ہم کو گئے ہو یہ تمھیں یاد رہے
ہم سے دیوانے رہیں شہر میں سبحان اللہ　　دشت میں قیس رہے کوہ میں فرہاد رہے

میرؔ اب بہار آئی صحرا میں چل جنوں کر
کوئی بھی فصلِ گل میں نادان گھر رہے ہے

اے حبِّ جاہ والو جو آج تاجور ہے　　کل اس کو دیکھیو تم نے تاج ہے نہ سر ہے
اے ہم صفیرِ بے گل کس کو دماغ نالہ　　مدت ہوئی ہماری منقار زیرِ پر ہے
شمع اخیرِ شب ہوں، سُن سرگذشت میری　　پھر صبح ہوتے تک تو قصّہ ہی مختصر ہے
اب رحم پر اسی کے موقوف ہے کہ یاں تو　　نے اشک میں سرایت نے آہ میں اثر ہے

ڈھونڈھا نہ پائیے جو اس وقت میں سو زر ہے — پھر چاہ جس کی مطلق ہے ہی نہیں، ہُنر ہے
ہر دم قدم کو اپنے رکھ احتیاط سے یاں — یہ کارگاہ ساری دکّانِ شیشہ گر ہے
اہل زمانہ رہتے اک طور پر نہیں ہیں — ہر آن مرتبے سے اپنے انھیں سفر ہے

شب شمع پر پتنگ کے آنے کو عشق ہے — اس دل جلے کے تاب کے لانے کو عشق ہے
اٹھیو سمجھ کے جا سے کہ مانند گرد باد — آوارگی سے تیری زمانے کو عشق ہے
اک دم میں تو نے پھونک دیا دو جہاں کے تئیں — اے عشق تیرے آگ لگانے کو عشق ہے

سودا ہو، تب ہو، میرؔ کو تو کر لیے کچھ علاج
اس تیرے دیکھنے کے دِوانے کو عشق ہے

پہنچے ہر اک نہ درد کو میرے — وہ ہی جانے جو ایسا حال رکھے
بحث ہے ناقصوں سے کاش فلک — مجھ کو اس زمرے سے نکال رکھے

سمجھے اندازِ شعر کو میرے
میرؔ کا سا اگر کمال رکھے

یاں جو وہ نونہال آتا ہے — جی میں کیا کیا خیال آتا ہے
اس کے چلنے کی آن کا بے حال — مدّتوں میں بحال آتا ہے

پر تو گذرا قفس ہی میں دیکھیں　　اب کی کیسا یہ سال آتا ہے
شیخ کی تو نماز پر مت جا　　بوجھ سر کا سا ڈال آتا ہے
آرسی کے بھی گھر میں شرم سے میرؔ
کم ہی وہ بے مثال آتا ہے

پیری میں کیا جوانی کے موسم کو روئیے　　اب صبح ہونے آئی ہے اک دم تو سوئیے
رخسار اس کے ہائے رے جب دیکھتے ہیں ہم　　آتا ہے جی میں آنکھوں کو ان میں گڑوئیے
اب جان جسمِ خاک سے تنگ آگئی بہت　　کب تک اس ایک ٹوکری مٹی کو ڈھوئیے
آلودہ اس گلی کی جو ہوں خاک سے تو میرؔ
آبِ حیات سے بھی نہ وے پانو دھوئیے

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ　　ان سے بھی تو پوچھتے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے
لیتے کروٹ ہل گئے جو کان کے موتی ترے　　شرم سے سر در گریباں صبح کے تارے ہوئے

کرے کیا کہ دل بھی تو مجبور ہے　　زمیں سخت ہے آسماں دور ہے
تمنّائے دل کے لیے جان دی　　سلیقہ ہمارا تو مشہور ہے
دل اپنا نہایت ہے نازک مزاج　　گرا گر یہ شیشہ تو پھر چور ہے

کہیں جو تسلّی ہوا ہو یہ دل وہی بے قراری بدستور ہے
بہت سعی کریے تو مر رہیے میرؔ
بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

اب میرجی تو اچھے زندیق ہی بن بیٹھے پیشانی پہ دے قشقہ زنّار پہن بیٹھے
آزردہ دلِ الفت ہم چپکے ہی بہتر ہیں سب رو اٹھے گی مجلس جو کر کے سخن بیٹھے

کہاں تک ناز برداری کروں شامِ غریباں کی کہیں گرد سفر سے جلد بھی صبح وطن نکلے
جنوں ان شورشوں پر ہاتھ کی چالاکیاں ایسی میں ضامن ہوں اگر ثابت بدن سے پیرہن نکلے
حرم میں میرؔ جتنا بت پرستی پر ہے تو مائل
خدا ہی ہو تو اتنا بت کدے میں برہمن نکلے

گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر یہ ہماری زبان ہے پیارے
شکلیں کیا کیا کیاں ہیں جن نے خاک یہ وہی آسمان ہے پیارے
میرؔ عمداً بھی کوئی مرتا ہے
جان ہے تو جہان ہے پیارے

بڑھتی نہیں پلک سے تا ہم تلک بھی پہنچیں — پھرتی ہیں وے نگاہیں پلکوں کے سائے سائے
پر کی بہار میں جو محبوب جلوہ گر تھے — سو گردش فلک نے سب خاک میں ملائے
یک حرف کی بھی مہلت ہم کو نہ دی اجل نے — تھا جی میں آہ کیا کیا پر کچھ نہ کہنے پائے
مدت ہوئی تھی بیٹھے جوش و خروش دل کو — ٹھوکر نے اس نگہ کی آشوب پھر اٹھائے

ٹک تمھارے ہونٹھ کے ہلنے سے یاں ہوتا ہے کام — اِتنی اُتنی بات جو ہووے تو مانا کیجیے

مہوشاں پوچھیں نہ ٹک ہجراں میں گر مر جائیے — اب کہو اس شہر ناپُرساں میں کیدھر جائیے
مضطرب اس آستاں سے اٹھ کے کچھ پایا نہ رؤ — منھ رہا ہے کیا جو پھر اب اس کے در پر جائیے

شوق تھا جو یار کے کوچے ہمیں لایا تھا میرؔ
پانو میں طاقت کہاں اتنی کہ اب گھر جائیے

غالب کہ یہ دل خستہ شب ہجر میں مر جائے — یہ رات نہیں وہ جو کہانی میں گذر جائے
یاقوت کوئی ان کو کہے ہے کوئی گل برگ — ٹک ہونٹھ ہلا تو بھی کہ اک بات ٹھہر جائے

اس ورطے سے تختہ جو کوئی پہنچے کنارے
تو میرؔ وطن میرے بھی شاید یہ خبر جائے

میں نے اُس قطعۂ صنّاع سے سر کھینچا ہے — کہ ہر اک کوچے میں جس کے تھے ہنرور کتنے
کشورِ عشق کو آباد نہ دیکھا ہم نے — ہر گلی کوچے میں اوجڑ پڑے تھے گھر کتنے
تو ہے بیچارہ گدا، میرؔ ترا کیا مذکور
مل گئے خاک میں یاں صاحبِ افسر کتنے

طاقت نہیں ہے دل میں نے جی بجا رہا ہے — کیا ناز کر رہے ہو، اب ہم میں کیا رہا ہے
جیب اور آستیں سے رونے کا کام گذرا — سارا نچوڑ اب تو دامن پر آ رہا ہے
کاہے کا پاس اب تو رسوائی دور پہنچی — رازِ محبّت اپنا کس سے چھپا رہا ہے
بندے تو طرح دارو، ہیں طرح کش تمھارے — پھر چاہتے ہو کیا تم، اب اک خدا رہا ہے
اتنا خزاں کرے ہے کب زرد رنگ پریاں — تو بھی کسو نگہ سے اے گل جدا رہا ہے
رہتے ہیں داغ اکثر نان و نمک کی خاطر — جینے کا اس سمیں میں اب کیا مزا رہا ہے

نہ پوچھو کہ احوال ناگفتہ بہ ہے — مصیبت کے مارے ہوئے دل کا اپنے
ہوا دفترِ قیس آخر ابھی یاں — سخن ہے جنوں کے اوائل کا اپنے
بنائیں رکھیں میں نے عالم میں کیا کیا — ہوں بندہ خیالاتِ باطل کا اپنے

کر بے خبر اک نگہ سے ساقی — لیکن کسو کو خبر نہ ہووے

خستے ترے موے عنبریں کے کیوں کر جییں صبر گر نہ ہووے
رکھ دیکھ کے راہ عشق میں پا
یاں میرؔ کسو کا سر نہ ہووے

کھول کر آنکھ اڑا دید جہاں کا غافل خواب ہو جائے گا پھر جاگنا سوتے سوتے
جم گیا خوں کفِ قاتل پہ ترا میرؔ زبس ان نے رو رو دیا کل ہاتھ کو دھوتے دھوتے

بارے نسیمِ ضعف سے کل ہم اسیر بھی سناہٹے میں جی کے گلستاں تلک گئے
کو موسم شباب، کہاں گل، کسے دماغ بلبل وہ ہم چہچے انھیں یاراں تلک گئے
پھاڑا تھا جیب پی کے مئے شوق میں نے میرؔ مستانہ چاک لوٹتے داماں تلک گئے

جن جن کو تھا یہ عشق کا آزار مر گئے اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے
صد کارواں وفا ہے کوئی پوچھتا نہیں گویا متاعِ دل کے خریدار مر گئے
مجنوں نہ دشت میں ہے نہ فرہاد کوہ میں تھا جن سے لطف زندگی وے یار مر گئے
گھبرا نہ میرؔ عشق میں اس سہل زیست پر جب بس چلا نہ کچھ تو مرے یار مر گئے

رکا جاتا ہے جی اندر ہی اندر آج گرمی سے بلا سے چاک ہی ہو جاوے سینہ ٹک ہوا آوے

ترا آنا ہی اب مرکوز ہے ہم کو دمِ آخر
یہ جی صدقے کیا تھا پھر نہ آوے تن میں یا آوے

یہ رسم آمد و رفتِ دیارِ عشق تازہ ہے
ہنسی وہ جائے میری اور رونا یوں چلا آوے

ہمارے دل میں آنے سے تکلف غم کو بیجا ہے
یہ دولت خانہ ہے اس کا وہ جب چاہے چلا آوے

برنگ بوے غنچہ عمر اک ہی رنگ میں گذرے
میسّر میرؔ صاحب گر دلِ بے مدّعا آوے

موئے ہی جاتے ہیں ہم دردِ عشق سے یارو
کسو کے پاس اس آزار کی دوا بھی ہے

اداسیاں تھیں مری خانقہ میں قابلِ سیر
صنم کدے میں تو ٹک آکے جی لگا بھی ہے

یہ کہیے کیونکہ کہ خوباں سے کچھ نہیں مطلب
لگے جو پھرتے ہیں ہم کچھ تو مدّعا بھی ہے

کہاں تلک شب و روز آہ دردِ دل کہیے
ہر ایک بات کو آخر کچھ انتہا بھی ہے

ہوس تو دل میں ہمارے جگہ کرے لیکن
کہیں ہجوم سے اندوہ غم کے جا بھی ہے

غمِ فراق ہے دنبالہ گردِ عیشِ وصال
فقط مزا ہی نہیں عشق میں بلا بھی ہے

گذار شہرِ وفا میں سمجھ کے کر مجنوں
کہ اس دیار میں میرؔ شکستہ پا بھی ہے

فریادِ اسیرانِ محبت نہیں بے ہیچ
یہ نالے کسو دل میں بھی تاثیر کریں گے

دیوانگی کی شورشیں دکھلائیں گے بلبل
آتی ہے بہار اب ہمیں زنجیر کریں گے

بازیچہ نہیں میر کے احوال کا لکھنا
اس قصّے کو ہم کرتے ہی تحریر کریں گے

باغِ نظر ہے چشم کے منظر کا سب جہاں — ٹک ٹھہر دیاں تو جانو کہ کیسا دکھاؤ ہے
اب سب کے روزگار کی صورت بگڑ گئی — لاکھوں میں ایک دو کا کہیں کچھ بناؤ ہے
چھاتی کے میرے ساری نمودار ہیں یہ زخم — پردہ رہا ہے کون سا، اب کیا چھپاؤ ہے

عاشق کہیں جو ہوگے تو جانوگے قدرِ میر
اب تو کسی کے چاہنے کا تم کو چاؤ ہے

تسلّی ان نے نہ کی ایک دو سخن سے کبھو — جو کوئی بات کہی بھی تو آدمی لکنت سے
یہ جہل دیکھ کہ اَن سمجھے میں، اٹھا لایا — گراں وہ بار جو تھا بیش اپنی طاقت سے

مری خلق محو کلام سب، مجھے چھوڑتے ہیں خموش کب
مرا حرف رشکِ کتاب ہے، مری بات لکھنے کا باب ہے
چلو مے کدے میں بسر کریں کہ رہی ہے کچھ برکت وہیں
لبِ ناں تو واں کا کباب ہے دمِ آب واں کا شراب ہے

نہیں کھلتیں آنکھیں تمھاری ٹک کہ مآل پر بھی نظر کرو
یہ جو وہم کی سی نمود ہے، اسے خوب دیکھو تو خواب ہے

گئے وقت آتے ہیں ہاتھ کب، ہوئے ہیں گنوا کے خراب سب
تجھے کرنا ہووے سو کر تو اب کہ یہ عمر برقِ شتاب ہے

تو جہاں کے بحرِ عمیق میں، سرِ پُر ہوا نہ بلند کر
کہ یہ پنج روزہ جو بُود ہے کسو موج پر کا حباب ہے

رکھو آرزو مئے خام کی کرو گفتگو خطِ جام کی
کہ سیاہ کاروں سے حشر میں نہ حساب ہے نہ کتاب ہے

مرا شور سن کے جو لوگوں نے کیا پوچھنا تو کہے ہے کیا
جسے میرؔ کہتے ہیں صاحبو، یہ وہی تو خانہ خراب ہے

آہ یہ رسمِ وفا ہووے برافتاد کہیں — اس ستم پر بھی مرا دل اُسی کا ممنوں ہے

اس دشت میں اے سیل سنبھل ہی کے قدم رکھ — ہر سمت کو یاں دفن مری تشنہ لبی ہے

دو سونپ دودِ دل کو، میرا کوئی نشاں ہے — ہوں میں چراغِ کشتہ، بادِ سحر کہاں ہے
بھڑکے ہے آتشِ گل، اے ابرِ تر ترحّم — گوشے میں گلستاں کے میرا بھی آشیاں ہے

کس دور میں اٹھایا مجھ سینہ سوختہ کو پیوند ہو زمیں کا جیسا یہ آسماں ہے

مژگاں بھی پھر گئیں تری بیمار چشم دیکھ دکھ درد میں سوائے خدا یار کون ہے
نالے جو آج سنتے ہیں سو ہیں جگر خراش کیا جانیے قفس میں گرفتار کون ہے
آیا نہ آشیانۂ بلبل میں کام بھی مجھ سا تو خار باغ میں بیکار کون ہے
بازار دہر میں ہے عبث میرؔ عرضِ مہر
یاں ایسی جنس کا تو خریدار کون ہے

مجھ سوز بعد مرگ سے آگاہ کون ہے شمع مزار میرؔ بجز آہ کون ہے
بے کس ہوں مضطرب ہوں مسافر ہوں بے وطن دوری راہ بن مرے ہمراہ کون ہے
لبریز جس کے حسن سے مسجد ہے اور دَیر ایسا بتوں کے بیچ وہ اللہ کون ہے
رکھیو قدم سنبھل کے کہ تو جانتا نہیں مانند نقشِ پا یہ سرِ راہ کون ہے
ایسا اسیر خستہ جگر میں سنا نہیں
ہر آہ میرؔ جس کی ہے جانکاہ کون ہے

دیکھا کروں تجھی کو منظور ہے تو یہ ہے آنکھیں نہ کھولوں تجھ بن مقدور ہے تو یہ ہے
نزدیک تجھ سے سب ہے کیا قتل کیا جِلانا ہم غمزدوں سے ملنا، اک دور ہے تو یہ ہے

کیا جانوں کیا کسل ہے واقع میں میرؔ کے تئیں
دو چار روز سے جو مشہور ہے تو یہ ہے

بے طاقتی نے دل کی آخر کو مار رکھا　　　آفت ہمارے جی کی آئی ہمارے گھر سے

انجامِ دلِ غم کش کوئی عشق میں کیا جانے　　　کیا جانیے کیا ہوگا آخر کو خدا جانے
میں خطِّ جبیں اپنا یارو کسے دکھلاؤں　　　قسمت کے لکھے کے تئیں یاں کون مٹا جانے
بے طاقتیِ دل نے ہم کو نہ کیا رسوا　　　ہے عشق سزا اس کی جو کوئی چھپا جانے
لے جائیے میرؔ اس کے دروازے کی مٹی بھی
اس دردِ محبّت کی جو کوئی دوا جانے

مند گئی آنکھ، ہے اندھیرا پاک　　　روشنی ہے سویاں مرے دم سے
مفت یوں ہاتھ سے نہ کھو ہم کو　　　کہیں پیدا بھی ہوتے ہیں ہم سے
کوئی بیگانہ گر نہیں موجود　　　منھ چھپانا یہ کیا ہے پھر ہم سے
درپئے خونِ میرؔ ہی نہ رہو
ہو بھی جاتا ہے جرم آدم سے

نالۂ عجز نقصِ الفت ہے — رنج و محنت کمال راحت ہے
تا دمِ مرگ غم خوشی کا نہیں — دلِ آزردہ گر سلامت ہے
رونا آتا ہے دمبدم شاید — کسو حسرت کی دل سے رخصت ہے
فتنے رہتے ہیں اس کے سائے میں — قد و قامت ترا قیامت ہے
نہ تجھے رحم نے اُسے ٹک صبر — دل پہ میرے عجب مصیبت ہے
کیا ہے پھر کوئی دم کو کیا جانو — دم غنیمت میاں جو فرصت ہے
تربتِ میرؔ پر ہیں اہلِ سخن — ق — ہر طرف ہے حرف ہے حکایت ہے
تو بھی تقریب فاتحہ سے چل
بخدا واجب الزیارت ہے

ہم قدِ خمیدہ سے آغوش ہوئے سارے — پر فائدہ، تجھ سے تو آغوش وہ خالی ہے
دو گام کے چلنے میں پامال ہوا عالم — کچھ ساری خدائی سے وہ چال نرالی ہے

باغ و بہار ہے وہ، میں کشتِ زعفراں ہوں — جو لطف اک اُدھر ہے تو یاں بھی اک سماں ہے
ہر چند ضبط کریے، چھپتا ہے عشق کوئی — گذرے ہے دل پہ جو کچھ چہرے ہی سے عیاں ہے
اس فن میں کوئی بے تہ کیا ہو مرا معارض — اوّل تو میں سند ہوں، پھر یہ مری زباں ہے
عالم میں آب و گل کا ٹھہراؤ کس طرح ہو — گر خاک ہے اڑے ہے ور آب ہے رواں ہے

از خویش رفتہ اُس بِن رہتا ہے میرؔ اکثر
کرتے ہو بات کس کی وہ آپ میں کہاں ہے

اُس دل جلے کی تاب کے لانے کو عشق ہے — فانوس کی سی شمع جو پردے میں جل سکے
ہے جائے حیف بزمِ جہاں، مل لے اے پتنگ — اپنے اوپر جو کوئی گھڑی ہاتھ مل سکے
کس کو ہے آرزوے افاقت فراق میں — ایسا تو ہو کہ کوئی گھڑی جی سنبھل سکے

ہم گرم رَو ہیں راہِ فنا کے شرر صفت — ایسے نہ جائیں گے کہ کوئی کھوج پا سکے
میرا جو بس چلے تو منادی کیا کروں — تا اب سے دل نہ کوئی کسو سے لگا سکے*
کیا دل فریب جائے ہے آفاق ہم نشیں — دو دن کو یاں جو آئے سو برسوں نہ جا سکے
مشعر ہے اس پہ مردنِ دشوارِ رفتگاں — یعنی جہاں سے دل کو نہ آساں اٹھا سکے

کیا غم میں ویسے خاک فتادہ سے ہو سکے — دامن پکڑ کے یار کا جو ٹک نہ رو سکے
برسوں ہی منتظر سرِ رہ پر ہمیں ہوئے — اس قسم کا تو صبر کسو سے نہ ہو سکے

یہ راہ و رسم دل شدگاں گفتنی نہیں — جانے دے میرؔ صاحب و قبلہ جدھر گئے
روزِ وداع اس کی گلی تک تھے ہم بھی ساتھ — جب درد مند ہم کو وے معلوم کر گئے

گر یک نگاہِ یاس کی ٹپ دے سی رو دیا　　　پھر ہم ادھر کو آئے میاں دے اُدھر گئے

شب خواب کا لباس ہے عریاں تنی میں یہ　　　جب سوئیے تو چادرِ مہتاب تانیے

نظر مطلق نہیں ہجراں میں اس کو حال پر میرے　　　مرا دل اُس کے غم میں گویا اس کا دل ہے کیا جانے

طرف ہونا مرا مشکل ہے میرؔ اس شعر کے فن میں

یوہیں سوداؔ کبھو ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے

کب تلک جی رُکے خفا ہووے　　　آہ کریے کہ ٹک ہوا ہووے

جی ٹھہر جائے یا ہوا ہووے　　　دیکھیے ہوتے ہوتے کیا ہووے

چُپ کا باعث ہے بے تمنّائی　　　کہیے کچھ بھی تو مدعا ہووے

بے کلی مارے ڈالتی ہے نسیم　　　دیکھیے اب کے سال کیا ہووے

مر گئے ہم، تو مر گئے، تو جی　　　دل گرفتہ تری بلا ہووے

عشق کیا ہے، درست اے ناصح　　　جانے وہ جس کا دل لگا ہووے

پھر نہ شیطاں سجود آدم سے　　　شاید اس پردے میں خدا ہووے

نہ سنا رات ہم نے اک نالہ

غالباً میرؔ مر رہا ہووے

کچھ تو کہہ، وصل کی پھر رات چلی جاتی ہے
دن گذر جائیں ہیں پر بات چلی جاتی ہے

رہ گئے گاہ تبسم پہ گہے بات ہی پر
بارے اے ہم نشیں اوقات چلی جاتی ہے

ٹک تو وقفہ بھی کرا ے گردشِ دوراں کہ یہ جان
عمر کے حیف ہے کیا ساتھ چلی جاتی ہے

یاں تو آتی نہیں شطرنج زمانے کی چال
اور واں بازی ہوئی مات چلی جاتی ہے

روز آنے پہ نہیں نسبتِ عشقی موقوف
عمر بھر ایک ملاقات چلی جاتی ہے

ایک ہم ہی سے تفاوت ہے سلوکوں میں میرؔ
یوں تو اوروں سے مدارات چلی جاتی ہے

منصف جو تو ہے کب تئیں یہ دکھ اُٹھائیے
کیا کیجے میری جان اگر مر نہ جائیے

تم نے جو اپنے دل سے بھلایا ہمیں تو کیا
اپنے تئیں تو دل سے ہمارے بھلائیے

فکرِ معاش، یعنی غمِ زیست تا کجے
مر جائیے کہیں کہ ٹک آرام پائیے

جاتے ہیں کیسی کیسی لیے دل میں حسرتیں
ٹک دیکھنے کو جاں بلبوں کے بھی آئیے

پہنچا تو ہوگا سمعِ مبارک میں حالِ میرؔ
اس پر بھی جی میں آوے تو دل کو لگائیے

نہیں وسواس جی گنوانے کے
ہائے رے ذوق دل لگانے کے

میرے تغیرِ حال پر مت جا
اتفاقات ہیں زمانے کے

دمِ آخر ہی کیا نہ آنا تھا — اور بھی وقت تھے بہانے کے
اب گریباں کہاں کہ اے ناصح — چڑھ گیا ہاتھ اس دوانے کے
چشمِ نجمِ سپہر جھپکے ہے — صدقے اس انکھڑیاں لڑانے کے
دل و دیں ہوش و صبر سب ہی گئے — آگے آگے تمھارے آنے کے
کب تو سوتا تھا گھر مرے آکر — جاگے طالع غریب خانے کے

کم فرصتیِ گل جو کہیں کوئی نہ مانے — ایسے گئے ایّامِ بہاراں کہ نہ جانے
ہمراہ جوانی گئے ہنگامے اٹھانے — اب ہم بھی نہیں وے رہے، نے وے ہیں زمانے
مرتے ہی سنے ہم نے کسل مند محبّت — اس درد میں کس کس کو کیا نفع دوانے
ٹک آنکھ بھی کھولی نہ زخود رفتہ نے اس کے — ہرچند کیا شور قیامت نے سرہانے
ان ہی چمنوں میں کہ جنھوں میں نہیں اب چھاؤں — کن کن روشوں ہم کو پھرایا ہے ہوا نے

تن ہجر میں اس یار کے رنجور ہوا ہے — بے طاقتیِ دل کو بھی مقدور ہوا ہے
پہنچا نہیں کیا سمعِ مبارک میں مرا حال — یہ قصّہ تو اس شہر میں مشہور ہوا ہے
بے خوابی تری آنکھوں پہ دیکھوں ہوں مگر رات — افسانہ مرے حال کا مذکور ہوا ہے
خورشید کی محشر میں تپش ہوگی کہاں تک — کیا ساتھ مرے داغوں کے محشور ہوا ہے
اے رشکِ سحر بزم میں لے منھ پہ نقاب اب — اک شمع کا چہرہ ہے سو بے نور ہوا ہے

چل قلم غم کی رقم کوئی حکایت کیجیے
ہر سرِ حرف پہ فریاد نہایت کیجیے

مت چلا عشق کی رہ کی کہ کہے ہے یاں خضر
آپ ہی گمراہ ہیں ہم کس کو ہدایت کیجیے

آہ ان خوش قامتوں کو کیونکر بر میں لائیے
جن کے ہاتھوں سے قیامت پر بھی عرصہ تنگ ہے

فکر کو نازک خیالوں کے کہاں پہنچے ہیں یار
ورنہ ہر مصرع یہاں معشوق شوخ و شنگ ہے

سرسری کچھ سن لیا پھر واہ وا کر اُٹھ گئے
ق
شعر یہ کم فہم سمجھے ہیں خیالِ بنگ ہے

صبر بھی کر لے بلا پر میرؔ صاحب جی کبھو
جب نہ تب رونا ہی کڑھنا یہ بھی کوئی ڈھنگ ہے

زیرِ فلک بھلا تو رو وے ہے آپ کو میرؔ
کس کس طرح کا عالم یاں خاک ہو گیا ہے

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
کہ میاں خوش رہو، ہم دعا کر چلے

جو تجھ بِن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو اب وفا کر چلے

وہ کیا چیز تھی آہ جس کے لیے
ہر اک چیز سے دل اٹھا کر چلے

کوئی ناامیدانہ کرتے نگاہ
سو تم ہم سے منھ بھی چھپا کر چلے

دکھائی دیے یوں کہ بیخود کیا
ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے

پرستش کی یاں تک کہ اے بُت تجھے
نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے

جی میں تھا عرش پہ جا باندھیے تکیہ لیکن　　بسترا خاک ہی میں اب تو بچھایا ہم نے
بعد یک عمر کہیں تم کو جو تنہا پایا　　ڈرتے ڈرتے ہی کچھ احوال سنایا ہم نے
یاں فقط ریختہ ہی کہنے نہ آئے تھے ہم　　چار دن یہ بھی تماشا سا دکھایا ہم نے

یہ ستم تازہ ہوا اور کہ پائیز میں میرؔ
دل خس و خار سے ناچار لگایا ہم نے

جی ڈوبتا ہے اس گہر تر کی یاد میں　　پایان کار عشق میں ہم مرچیے ہوئے
سی چاکِ دل کہ چشم سے ناصح لہو تھے　　ہوتا ہے کیا ہمارے گریباں سیے ہوئے

کرو توکّل کہ عاشقی میں نہ یوں کروگے تو کیا کروگے
الم جو یہ ہے تو دردمندو کہاں تک تم دوا کروگے
جگر میں طاقت کہاں ہے اتنی کہ درد ہجراں سے مرتے رہیے
ہزار وعدے وصال کے تھے کوئی بھی جیتے وفا کروگے
اخیر الفت یہی نہیں ہے کہ جل کے آخر ہوئے پتنگے
ہوا جو یاں کی یہ ہے تو یارو غبار ہوکر اڑا کروگے
بلا ہے ایسا طپیدن دل کہ صبر اس پر ہے سخت مشکل
دماغ اتنا کہاں رہے گا کہ دست بر دل رہا کروگے

نہ دیکھا غمِ دوستاں شکر ہے — ہمیں داغ اپنا دکھا کر چلے
گئی عمر در بندِ فکرِ غزل — سو اس فن کو اتنا بڑا کر چلے
کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میرؔ
جہاں میں تم آئے تھے، کیا کر چلے

عالم مری تقلید سے خواہش تری کرنے لگا — میں تو پشیماں ہو چکا، لوگوں کو اب ارمان ہے
اس بیدمی میں بھی کبھو دل بھر اٹھے ہے دم ترا — آ تک شتابی بے وفا، اب تک تو مجھ میں جان ہے

دشمنی جانی ہے اب تو ہم سے، غیروں کے لیے — اک سماں سا ہو گیا وہ بھی کہ ہم یاروں میں تھے

جس جگہ دورِ جام ہوتا ہے — واں یہ عاجز مدام ہوتا ہے

ہم خامشوں کا ذکر تھا شب اس کی بزم میں — نکلا نہ حرفِ خیر کسو کی زبان سے
اب چھیڑ یہ رکھی ہے کہ عاشق ہے تو کہیں — القصہ خوش گذرتی ہے اُس بدگمان سے

چاک پر چاک ہوا، جوں جوں سِلایا ہم نے — اس گریباں ہی سے اب ہاتھ اٹھایا ہم نے
حسرتِ لطفِ عزیزانِ چمن جی میں رہی — سر پہ دیکھا نہ گل و سرو کا سایہ ہم نے

عدم میں ہم کو یہ غم رہے گا کہ اوروں پر اب ستم رہے گا
تمھیں تو لت ہے ستانے ہی کی کسو پہ آخر جفا کرو گے
اگرچہ اب تو خفا ہو لیکن موئے گئے پر کبھو ہمارے
جو یاد ہم کو کرو گے پیارے تو ہاتھ اپنے ملا کرو گے
غمِ محبّت سے میرؔ صاحب بتنگ ہوں میں، فقیر ہو تم
جو وقت ہوگا کبھو مساعد تو میرے حق میں دعا کرو گے

ہے خاک جیسے ریگ رواں، سب نہ آب ہے — دریائے موج خیز جہاں کا سراب ہے
اس شہرِ دل کو تو بھی جو دیکھے تو اب کہے — کیا جانیے کہ بستی یہ کب کی خراب ہے
سُن کان کھول کر کہ تنک جلد آنکھ کھول — غافل یہ زندگانی فسانہ ہے، خواب ہے

کیا کیا بیٹھے بگڑ بگڑ تم پر ہم تم سے بنائے گئے — چپکے باتیں اٹھائے گئے سر گاڑے ووہیں آئے گئے
صبح وہ آفت اُٹھ بیٹھا تھا تم نے نہ دیکھا صد افسوس — کیا کیا فتنے سر جوڑے پلکوں کے سائے سائے گئے

اِدھر سے ابر اُٹھ کر جو گیا ہے — ہماری خاک پر بھی رو گیا ہے
مصائب اور تھے پر دل کا جانا — عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے
سرہانے میرؔ کے کوئی نہ بولو — ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

عمر بھر ہم رہے شرابی سے　　دلِ پُر خوں کی اک گلابی سے
دل ڈہا جائے ہے سحر سے آہ　　رات گذرے گی کس خرابی سے
کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے　　اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے
برقع اٹھتے ہی چاند سا نکلا　　داغ ہوں اس کی بے حجابی سے

کام تھے عشق میں بہت پر میرؔ
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

کتابیات

1	کلیاتِ میر	۱۔ نسخہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ	1811
		۲۔ نسخہ مرتبہ عبدالباری آسی	
		نولکشور پریس ۔ لکھنؤ	194
2	میر کی آپ بیتی	اردو ترجمہ : نثار احمد فاروقی	1957
		مکتبہ برہان ، دہلی	
3	دلی کالج اردو میگزین	میر نمبر	
		مرتبہ : نثار احمد فاروقی	
		دہلی کالج ، دہلی ۶	1963
4	تلاشِ میر	نثار احمد فاروقی	
		مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۔ دہلی	1974
5	نقوش (لاہور)	میر نمبر حصہ اوّل و دوم	1982
		مرتبہ : محمد طفیل	
		ادارہ فروغ اردو لاہور	
6	نقدِ میر	ڈاکٹر سید عبداللہ	